قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

قیمت فی پرچہ
ایک روپیہ

ٹیلیفون
۸۰۸۰۰
خط و کتابت
ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵۔بی گلبرگ لاہور

بدل اشتراک
پاکستان
سالانہ ___ دس روپے
غیر ممالک
سالانہ ___ ایک پونڈ

جلد (۲۵)
جنوری ۱۹۷۲ء
نمبر (۱)

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

بدل اشتراک

پاکستان

سالانہ ـــــ دس روپے

غیر ممالک

سالانہ ـــــ ایک پونڈ

ٹیلیفون

۸۰۸۰۰

خط و کتابت

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام - ۲۵/بی گلبرگ لاہور

قیمت فی پرچہ

ایک روپیہ

نمبر (۱)

جنوری ۱۹۷۲ء

جلد (۲۵)

فہرست

(۱) جنگ دسمبر ۱۹۷۱ء کے برقی پارے ـــــ ۲

(۲) لمعات ـــــ ۳

(۳) ہمارا ازلی دشمن ـــــ ۲۲

(۴) عید کا پیغام ـــــ ۳۲

(۵) وہی مرتجیٰ، وہی عنتری ـــــ ۳۳

(۶) اے دوست سنائے جا جھوٹے سچے افسانے ـــــ ۳۴

(۷) "عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں" ـــــ ۴۶

(۸) ایک چراغ اور لاکھ اندھیرے ـــــ ۵۳

ایڈیٹر۔ محمد خلیل ناشر۔ سراج الحق۔ مقام اشاعت۔ ۲۵/بی گلبرگ لاہور۔ پرنٹر۔ شیخ محمد اشرف۔ مطبوعہ۔ اشرف پریس۔ ایبک روڈ۔ لاہور

جنگِ دسمبر ۱۹۷۱ء کے برق پارے

تم پہ خدا کا ہزار ہزار سلام

بھارتی فوج کے لیفٹیننٹ کرنل وی۔ پی۔ ایری، کمانڈنگ آفیسر گرینیڈیئر گارڈز نے جنگ بندی کے بعد پاکستانی فوج کے متعلقہ افسر کے نام ایک نوٹ بھیجا ہے جس کا عنوان ہے — ایک سپاہی کو خراجِ عقیدت۔ اس میں وہ لکھتا ہے:

لیفٹیننٹ کرنل حاجی اکرام راجہ نے بھارتی مورچوں پر جوابی حملہ کیا اور بہادری کی موت پائی۔ اس کا چہرہ ہماری مشین گن سے چھلنی ہو چکا تھا۔ جب ہم نے اس کی شہادت کے بعد دیکھا تو وہ اس پوزیشن میں بیٹھے تھے جس پوزیشن میں جوابی حملے کے وقت سپاہی ہوتے ہیں۔ ان کے ہاتھ مشین گن پر جمے ہوئے تھے۔ اس سے اس بہادر کے اس عزم، جواں مردی، جرأت اور بسالت کا پتہ چلتا ہے جس سے انہوں نے جوابی حملہ کیا تھا۔ جرأت اور بہادری کی یہ ایک اعلیٰ مثال تھی۔ اور ہم نہیں چاہتے کہ اس بہادر سپاہی کو خراجِ عقیدت پیش نہ کریں اور اس کی بہادری کے سامنے سر نہ جھکائیں۔ خدا کی اس پر رحمت ہو۔ (نوائے وقت۔ ۲۰-۱۲)

دشمن کا یہ اظہارِ عقیدت ہمارے ایک شہید "اکرام راجہ" کی بارگاہ میں نہیں، افواجِ پاکستان کے ہر افسر اور جوان کے لئے ہے۔

اے ملتِ پاکستانیہ کے مقدر کے تابندہ ستارو! قوم کو تم پر ہزار فخر اور صد ہزار ناز ہے کہ تمہارے خلوص، ایثار، جواں ہمتی، جاں سپاری، جگر پاشی اور خود سپردگی نے ہمیں دنیا میں سر اٹھا کر چلنے کے قابل بنا دیا۔ یہ جو ہماری جانیں، مال، دولت، عزت، آبرو محفوظ ہے تو سب تمہارے مقدس خون کا صدقہ ہے۔ یہ جو ہماری عفت مآب ماؤں، بہنوں کے دوپٹے، اور ہماری معصوم بچیوں کی "چُنیاں" ان کے سروں کو ڈھانپے ہوئے ہیں، تو یہ سب تمہارے پاکیزہ سینوں کی سپر کے طفیل ہے۔ قوم کو تم پر ناز ہے۔ اس کا سر بصد احترام تمہارے عزمِ بلند کے سامنے جھکا ہوا ہے۔

مشرقی پاکستان میں جو حادثہ فاجعہ ہم پر گزرا ہے اس سے تمہیں قطعاً دل برداشتہ نہیں ہونا چاہیئے۔ اس لئے کہ اس سے تمہارے دامن پر کوئی دھبہ نہیں آتا۔ قوم ایک مہیب اور عمیق سازش کا شکار ہوئی ہے جس کا ہدف تم اور ہم سب ہیں۔ اس سے نہ تمہارے وقار میں کوئی فرق آتا ہے نہ ہمارے جذبۂ احترام میں کوئی کمی۔ تم وہی قابلِ صد رشک غزالِ رعنا ہو اور ہماری آنکھوں کے تارے۔ تم ہی وہ بہادر جری ہو جن پر خود خالقِ کائنات نے یہ کہہ کر تبریک و تحسین کے پھول برسائے ہیں کہ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۖ وَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ۔ (۲/۱۵۷) یہ وہ ہیں جن پر ان کے رب کی طرف سے سلام و رحمت ہے اور یہ وہ ہیں جن کے سامنے کامرانیوں اور شادکامیوں کے راستے کشادہ ہیں۔

اے قوم کے رکھوالو! اللہ تعالیٰ تمہارا حافظ و ناصر ہو کہ تمہاری حفاظت سے، قوم محفوظ ہے۔ قوم کی ہر متاعِ عزیز محفوظ ہے۔ ہماری عزتیں محفوظ ہیں، عصمتیں محفوظ ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ یہ خطۂ ارض محفوظ ہے جو خدا کے دین کے تمکن کے لئے حاصل کیا گیا ہے۔

عشق میں ایک تم ہمارے ہو ؎ باقی جو کچھ ہے سب تمہارا ہے

(ﷺ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا وہ طوفاں نکلا

طلوعِ اسلام کنونشن، ۲۵ تا ۲۸ نومبر کو منعقد ہونیوالی تھی۔ قارئین نے اس کے پروگرام میں دیکھا ہوگا کہ ۲۷ نومبر کے چھٹے اجلاس میں پرویز صاحب کے خطاب کا عنوان تھا۔

'پاکستان کے متعلق خدائی فیصلہ'

انہوں نے اس خطاب میں قوموں کی موت اور حیات کے متعلق قرآنی اصول و قوانین کو بالتفصیل پیش کرنے کے بعد آخر میں لکھا تھا،

> قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ غلط نظام کے تباہ کن نتائج آہستہ آہستہ مرتب ہوتے رہتے ہیں اور انکی آخری شکل وہ ہوتی ہے جب تباہی محسوس طور قوم کے سامنے آجاتی ہے۔ اگر وہ قوم اس سے پہلے اپنے اندر تبدیلی پیدا کرلے تو اس کے بچاؤ کی صورت ہوسکتی ہے لیکن جب تباہی محسوس طور پر سامنے آجائے تو پھر وہ اس سے بھاگ کر کہیں نہیں جاسکتی۔ دیکھئے، سورۃ الانبیاء میں اس حقیقت کو کیسے محاکاتی انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ فرمایا۔ وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَّ اَنْشَاْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ۔ کتنی ہی قومیں ایسی تھیں جو اپنے اس نظام کی وجہ سے جو ظلم اور ناانصافی پر مبنی تھا، تباہ ہوگئیں۔ ان کی حالت یہ تھی کہ انہیں ان کی غلط روش کے تباہ کن مآل سے آگاہ کیا گیا لیکن انہوں نے ایک نہ سنی۔ وہ اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ ہم جس روش پر چل رہے ہیں اس سے ہمیں اس قدر فروغ حاصل ہو رہا ہے اس لئے اس کا نتیجہ تباہی کس طرح ہوسکتا ہے؟ وہ یہ نہیں سمجھتے تھے کہ اس کے نتائج غیر محسوس طور پر اندر ہی اندر مرتب ہوتے چلے جارہے ہیں۔ چنانچہ جب یہ مدت ختم ہوگئی۔ فَلَمَّآ اَحَسُّوْا بَاْسَنَآ اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَرْكُضُوْنَ۔ اور ان کی تباہی محسوس شکل میں ان کے سامنے آگئی تو وہ لگے بھاگنے۔ لیکن ہمارے قانونِ مکافات نے انہیں للکار کر کہا۔ لَا تَرْكُضُوْا ۔ بھاگو نہیں۔ تم بھاگ کر کہیں نہیں جاسکتے۔ وَارْجِعُوْٓا اِلٰى مَآ اُتْرِفْتُمْ فِيْهِ وَمَسٰكِنِكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْـَٔــلُوْنَ ۔ چلو واپس اپنے محلات اور اس سامانِ تعیش کیطرف جو تم نے اپنے لئے فراہم کر رکھا تھا۔ چلو واپس تاکہ تم سے پوچھا جائے کہ تم نے اتنا مال و دولت

کہاں سے حاصل کیا تھا۔ وہ مظلوم کون سے تھے جن کے خون کی رنگینی تمہارے محلات کے لئے وجۂ آرائش و زیبائش بنی تھی۔ قَالُوا يَا وَيْلَنَا إِنَّا كُنَّا ظَالِمِينَ. چنانچہ جب انہیں گرفتار کر کے مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا کیا گیا تو انہوں نے اعتراف کیا کہ ہم نے یہ سب کچھ ظلم اور استحصال سے حاصل کیا تھا۔ فَمَا زَالَتْ تِلْكَ دَعْوَاهُمْ حَتَّىٰ جَعَلْنَاهُمْ حَصِيدًا خَامِدِينَ ۔ (۲۱/۱۴-۱۵) وہ یہ واویلا مچاتے رہے لیکن اس وقت اس پکار اور فریاد نے انہیں کوئی فائدہ نہ دیا، اور وہ قوم ایسی ہو گئی جیسے کوئی کٹا ہوا کھیت ہو یا بجھا ہوا شعلہ۔

پرویز صاحب نے یہ خدائی فیصلہ ۲۰ر نومبر کو قوم کے سامنے پیش کرنا تھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ فطرت کے حساب و شمار کے مطابق، مہلت کا وقفہ ختم ہو چکا تھا اس لئے یہ فیصلہ ۱۶ر دسمبر کو عملاً نافذ ہو گیا اور ہمیں یہ سزا ایسی ذلت آمیز اور رسواکن شکل میں ملی جس کی نظیر آسمان کی آنکھ نے اس سے پہلے کہیں نہیں دیکھی تھی۔ جنگ میں فوجوں کو فتح بھی حاصل ہوتی ہے شکست بھی۔ قوموں کو عروج بھی ملتا ہے زوال بھی۔ مملکتیں بنتی بھی ہیں بگڑتی بھی۔ سلطنتیں ابھرتی بھی ہیں ڈوبتی بھی۔ تاریخ کے اوراق اس گردشِ دولابی کے شاہد ہیں۔ وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ (۳/۱۴۰) خود قرآن کی شہادت ہے۔ یہ کچھ ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہیگا۔ لیکن اس قسم کی قیامت کبریٰ کو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتی تھی، کہ سات کروڑ کی آبادی جس میں قریب ایک لاکھ مسلح فوج بھی موجود ہو، راتوں رات ہندو جیسی ذلیل قوم کی غلامی کی زنجیروں میں جکڑی جائے گی! اس قسم کی تباہی بغیر کسی سازش کے کبھی ظہور میں نہیں آ سکتی تھی — سازش اور ایسی مہیب سازش! غداری اور ایسی شیاد غداری!! آسمان را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں —

طلوعِ اسلام، تحریکِ پاکستان، مطالبۂ پاکستان اور حصولِ پاکستان کے جہاد میں مسلسل شریک رہا پھر تشکیلِ پاکستان کے بعد اس خطۂ زمین کے تحفظ، استحکام اور سالمیت کے لئے تا بحدِ امکان سرگرمِ عمل رہا۔ اس لئے کہ یہ خطۂ ارض اس کی حسین تمناؤں کی آماجگاہ اور اس کی مقدس آرزوؤں کی تکمیل کا ذریعہ تھا! کامل تیتیس سال کی جہدِ مسلسل کے بعد ان خوابوں کا یوں پریشان ہو جانا، ایسا صدمہ نہیں جسے ایک دن میں بھلایا جا سکے۔ اس پر ہماری آنکھیں ہی نہیں، ہماری آنے والی نسلوں کی آنکھیں بھی صدیوں تک خونفشاں رہیں گی۔ مرنے والے افراد کی صفِ ماتم، تیسرے دن یا زیادہ سے زیادہ چالیس روز لپیٹ دی جاتی ہے، لیکن مرگِ ملت کی صفِ ماتم قرنہا قرن تک بچھی رہتی ہے۔ یہ زخم کبھی مندمل نہیں ہو سکتے۔

مرا رونا نہیں، رونا ہے یہ سارے گلستاں کا
وہ گل ہوں میں، خزاں ہر گل کی ہے گویا خزاں میری

لیکن ہمارا یہ رونا 'دیدۂ (حضرت) یعقوبؑ کے آنسو ہیں جنہوں نے شدتِ حزن و ملال کے عالم میں کہا تھا کہ إِنَّمَا أَشْكُو بَثِّي وَحُزْنِي إِلَى اللَّهِ (۱۲/۸۶) میں اپنے غم و الم کی فریاد اپنے خدا کے حضور کرتا ہوں۔ کسی انسان سے کچھ نہیں کہتا۔ ہماری قوم پہلے ہی بڑی جذباتی واقع ہوئی ہے اور ظاہر ہے کہ جب اس قسم کی قوم پر ایسی قیامت کی گھڑی گزر جائے — اور وہ بھی اس طرح اچانک اور غیر متوقع طور پر — تو وہ اپنے اوسان بجا نہیں رکھ سکتی کہ — مجنوں از خود رفتن کار ہر دیوانہ نیست — چنانچہ اس از خود رفتگی اور حواس باختگی کے عالم میں اس اس قسم کی آوازیں کان میں پڑ رہی ہیں کہ یہ ملک بالکل وحشت کدہ دکھائی دیتا ہے۔ لیکن طلوعِ اسلام جس قرآنی

پیغام کا علمبردار ہے اس کی تعلیم یہ ہے کہ انتہائی غم والم کی حالت میں بھی دامنِ فکر کو ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے۔ جنگ میں انسانی جذبات انتہائی شدت تک پہنچ جاتے ہیں لیکن قرآن کریم اس حالت میں بھی غور و فکر کی تاکید کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جماعتِ مومنین کے مقابلہ میں مخالفین کی شکست کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ۔ (۸/۶۵) وہ لوگ غور و تدبر سے کام نہیں لیتے تھے۔ لہٰذا ہمیں شدتِ جذبات کے سیلاب میں بہ جانے کے بجائے انتہائی سکون سے یہ سوچنا چاہیئے کہ ہماری شکست کے اسباب کیا تھے اور وہ عناصر کیا جن کی وجہ سے ہمیں اس ذلت و رسوائی کا منہ دیکھنا پڑا۔ ان میں بعض اسباب تو ہنگامی اور عاجلہ ہیں — انہیں آپ علاماتِ مرض کہہ سکتے ہیں — اور بعض حقیقی اور بنیادی جو علتِ مرض کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جہاں تک ہنگامی اسباب و علل کا تعلق ہے، اب ملک میں سول حکومت قائم ہو رہی ہے۔ ہماری ان سے درخواست ہے (اور ہمارا خیال ہے کہ وہ خود بھی اپنی اس ذمہ داری کا احساس کریں گے) کہ وہ اس معاملہ میں پوری پوری تحقیق کریں۔ اور اگر اس حادثہ کبریٰ میں غداری اور سازش کا شائبہ تک بھی نظر آئے تو متعلقہ افراد کے خلاف مقدمات دائر کئے جائیں اور مجرم ثابت ہونے پر انہیں ایسی سزائیں دی جائیں جو دوسروں کے لئے آیۂ عبرت ہوں۔ ہم نے غداروں کے ساتھ جو مداہنت اور تسامح کا برتاؤ کیا ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ یہ شجرِ خبیث بڑھتا اور پھولتا پھلتا چلا جا رہا ہے۔ اس سلسلہ میں آج (۲۰ دسمبر) کے اخبارات میں بعض ایسے امور کا انکشاف ہوا ہے کہ اگر وہ صحیح ثابت ہو جائیں تو جرمِ غداری کے ارتکاب کے سلسلہ میں کسی مزید ثبوت کی ضرورت ہی نہیں رہیگی۔ ہم اس سلسلہ میں روزنامہ نوائے وقت (لاہور) کا شذرہ درج ذیل کرتے ہیں۔ جو ذیلی اداریہ کی شکل میں شائع ہوا ہے۔ اس کا عنوان ہے "اگر یہ سچ ....." اور اس کے تحت لکھا ہے:-

> چینی سفیر متعینہ پاکستان کی طرف سے یہ انکشاف پورے پاکستان کے لئے حیران کن ہے کہ موجودہ جنگ میں چین سے کوئی مدد طلب ہی نہیں کی گئی۔ ہم حیران ہوتے تھے کہ جب ایئر مارشل اصغر رحیم نے اپنے ایک بیان میں یہ فرمایا تھا کہ ہمیں دورانِ جنگ کسی دوست کی طرف سے کوئی امداد نہیں پہنچی، اب اس کی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ پاکستان کے صدر نے نہ صرف یہ کہ چین سے امداد طلب نہیں کی بلکہ استفسار پر یہ جواب دیا کہ ہمیں چین کی مدد کی ضرورت نہیں ہے! ایک مخلص اور بروقت کام آنے والے دوست کی امداد سے عین امداد کے وقت یہ انکار اس سازش کی نشاندہی کرتا ہے جس کی بنا پر مشرقی پاکستان کو قربان کر کے مغربی پاکستان میں مسندِ اقتدار بچانے والوں کا منشا پورا ہو سکتا تھا۔ سارا پاکستان منتظر تھا کہ چین اپنے دعووں کے باوجود وقت پر مدد کیوں نہ دے سکا۔ اور اب ہم کو معلوم ہوا ہے اور چین ہی کے ذمہ دار سفیر کی زبانی معلوم ہوا ہے۔ اگر چینی امداد بروقت پہنچ جاتی تو سازشیوں کا منصوبہ ناکام رہ جاتا۔

اس کے بعد لکھا ہے:-

> دنیا میں ملکوں اور قوموں کے ساتھ — بے وفائی — کی مثالیں تو مل جائیں گی لیکن اس سنگدلی اور شقاوت کی مثال کہاں ملے گی کہ ہمارا لہو بہہ رہا تھا اور ہمارے زخموں پر مرہم رکھنے والے ہاتھ کو جھٹک دیا گیا تھا۔ ماؤں کے لال کٹ رہے تھے، سہاگنوں کے سہاگ اجڑ رہے تھے، معصوم بچے یتیمی کے

خوفناک جنگل میں بھٹکتے جا رہے تھے۔ لیکن بیدرد تماشائیوں اور ذلیل سازشیوں نے اس صورتِ حالات کی روک تھام کی جگہ نہ صرف اسلامیانِ پاکستان بلکہ اسلامیانِ عالم کو ذلیل کرانے کی ٹھان رکھی تھی! کون ہے جو اس خون کا حساب مانگے؟ کون ہے جو اس سنگدلی اور شقاوت کا مواخذہ کرے! ؎

مردے از غیب بروں آید و کارے بکند

اس مواخذہ کے لئے "مردے از غیب" کے انتظار کی ضرورت نہیں۔ یہ سول حکومت کا اولین فریضہ ہے جس کی ادائیگی کے لئے ملک کی طرف سے زور دیا جانا چاہیئے۔

دوسری بات اسی روزنامہ کے اداریہ میں سامنے لائی گئی ہے۔ اداریہ کا عنوان ہے "نئی سازشوں سے ہشیار" اور اس کے تحت اس جدید آئین کے سلسلہ میں جسے (سابق جنرل) یحیٰی نے مرتب کرایا تھا، تحریر ہے۔

نئے آئین کا ۲۰ دسمبر کو اعلان کیا جا رہا ہے۔ اس آئین کی جو تفاصیل مصدقہ ذرائع سے منظرِ عام پر آئی ہیں ان پر ایک سرسری نگاہ سے ہی یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ اس کے تحت ایک کمزور اور ڈھیلے وفاق میں صوبوں کو زیادہ سے زیادہ آزادی و خود مختاری دینے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ بلکہ شیخ مجیب کے چھ نکات سے بھی دو قدم آگے بڑھ کر صوبوں کو براہِ راست غیر ممالک سے معاہدے کرنے کا اختیار دیا گیا ہے"۔

اس آئین کو بروئے کار لانے کا یہ مطلب ہوگا کہ مغربی پاکستان میں بھی چار "خود مختار ملک" قائم ہو جائیں گے ان میں سے ہر "ملک" (صوبہ) کسی دوسرے ملک کے ساتھ ہر قسم کا معاملہ کرنے میں آزاد ہوگا۔ اگر بلوچستان میں مستقبل کی کسی حکومت کو روس ساحلِ مکران پر بندرگاہ قائم کرنے کے لئے پچاس کروڑ یا ایک ارب ڈالر کی پیشکش کرے تو یہ حکومت روس سے سودے بازی کرنے میں آزاد ہوگی۔ اسی طرح پنجاب کی کوئی حکومت خدانخواستہ اپنے تجارتی مفادات کے لئے بھارت سے کوئی ایسا سمجھوتہ کر سکتی ہے جو پاکستان کے مجموعی مفاد کے منافی ہو۔

پچھلے دنوں ملک میں یہ خبر گشت لگا رہی تھی (اور جہاں تک ہمیں یاد پڑتا ہے نورالامین صاحب نے بھی اس کا ذکر کیا تھا) کہ اس قسم کی کوششیں بھی ہو رہی ہیں کہ مغربی پاکستان کو ایران کے ساتھ ملحق کر کے، اس کے جداگانہ تشخص کو ختم کر دیا جائے۔ اگر مجوزہ آئین میں یہ شق فی الواقعہ موجود ہے تو یہ بہت بڑی سازش ہے۔ اس سے بلوچستان (اور سندھ بھی) ایران کے ساتھ معاہدہ کر سکیگا اور صوبہ سرحد افغانستان کے ساتھ۔ اور پھر پاکستان نام رہ جائے گا پنجاب کا جسے مشرقی پنجاب ایک ہی جھپٹے میں لے اڑیگا۔

ان الزامات کے علاوہ، اس قسم کے الزامات بھی تحقیق طلب ہونگے کہ

(۱) مجیب الرحمٰن کے چھ نکات، لیگل فریم ورک آرڈر (L.F.O.) کے یکسر خلاف تھے۔ پھر اسے اپنے نکات کا اس قدر وسیع پیمانے پر پراپیگنڈہ کرنے اور انہی کے مطابق الیکشن لڑنے کی اجازت کیوں دی گئی۔

(۲) حکومت کی طرف سے شائع کردہ قرطاس ابیض کی رو سے (سابق جنرل) یحیٰی ڈھاکہ میں بیٹھے تھے اور ان کے سامنے لاکھوں بے گناہ انسانوں کا قتلِ عام ہوتا رہا۔ آتش زنی اور غارت گری کی روش عام رہی اور عفت مآب خواتین اور معصوم بچیوں کی عصمت بے محابا لوٹی گئی اور وہ یہ سب کچھ نہایت سکون و اطمینان سے دیکھتے رہے۔

(۳) کالعدم عوامی لیگ کے باغی لیڈروں کو ہندوستان کیطرف فرار ہو جانے کا موقعہ فراہم کیا گیا اور مجیب کے مقدمہ کو اس قدر طوالت دی گئی۔

(۴) اس دوران میں صدر نکسن کے بیان کے مطابق، سابق جنرل ان باغیوں کے سرغنوں سے کلکتہ میں گفتگو سے مصالحت کی پیشکش کرتے رہے۔

(۵) عام افواہ ہے کہ اس جنگ میں پاکستانی افواج کو آگے بڑھنے سے روک دیا گیا۔ (۶) جنرل نیازی ہتھیار ڈالنے پر آمادہ نہیں تھے لیکن انہیں ایسا کرنے پر مجبور کیا گیا۔ بلکہ یہ بھی کہ ایسے حالات دانستہ پیدا کئے گئے جن کی وجہ سے ہماری یہ قریب ایک لاکھ سرفروشوں پر مشتمل فوج، دشمنوں کے نرغے میں گھر جائے (۳) جنگ کے آخری دنوں، مغربی پاکستان میں فضائیہ کو حکم دے دیا گیا کہ جب بھارتی جہاز شہری بستیوں پر بمباری کریں تو ان کا تعاقب نہ کیا جائے۔ یہ اس لئے کیا گیا کہ شہری آبادی کے حوصلے پست ہو جائیں اور وہ غنیمت سمجھے کہ جنگ بند کر دی گئی ہے۔

یہ اور اسی قسم کے دیگر الزامات ہیں جن کی تحقیق رسول حکومت کا اولین فریضہ ہونا چاہیئے۔ لیکن یہ اشد ضروری ہے کہ جو کچھ کیا جائے عوام کو اس سے باخبر رکھا جائے۔ قوم کی موجودہ بد دلی اور مایوسی کی ایک بنیادی وجہ یہ بھی ہے کہ اسے حالات سے یکسر بے خبر رکھا گیا۔ اسے مسلسل تاریکی میں رکھا گیا۔ اول تو اسے بتایا ہی کچھ نہ گیا اور جو کچھ بتایا گیا۔ مابعد واقعات نے اسے جھوٹ ثابت کر دیا۔ اس دور میں حکمران طبقہ اور عوام میں اتنا زیادہ بُعد پیدا ہو چکا تھا جس کی مثال اس سے پہلے کہیں نہیں ملتی حتیٰ کہ انگریز کے دورِ حکومت میں بھی نہیں۔ استبداد و ملوکیت اسی کو کہتے ہیں کہ افراد معاشرہ کو اس قابل ہی نہ سمجھا جائے کہ انہیں کسی معاملہ میں اعتماد میں لیا جائے۔ لہٰذا اب ضروری ہوگا کہ عوام اور حکمران طبقہ کے درمیان حائل شدہ اس خلیج کو پاٹ دیا جائے ... واضح رہے کہ ہم نے "حکمران طبقہ اور عوام" کی اصطلاحیت، مروجہ سیاسی اعتبار سے استعمال کی ہیں، ورنہ قرآنی نظام میں حکمرانوں کا کوئی الگ طبقہ نہیں ہوتا۔ اس میں صرف تقسیم کار کا اصول عمل پیرا ہوتا ہے۔ وہاں تو کیفیت یہ ہوتی ہے کہ رسول اللہ کو ایک دفعہ کسی نے یا سیدی (اے ہمارے سردار) کہہ دیا تھا۔ تو حضورؐ نے اسے ڈانٹ دیا تھا۔

(۰)

یہاں تک تو ہم نے کسی نہ کسی طرح دل پر جبر اور اپنے آپ پر ضبط کر کے لکھ دیا ہے، لیکن اب وہ مرحلہ سامنے آتا ہے جس کے تصور سے ہاتھوں میں قلم کانپ رہا اور آنکھوں سے جوئے خون جاری ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اسکے متعلق کیا لکھیں اور کس طرح لکھیں۔ ہم نے ملک کھو دیا۔ ہم نے اپنے ہاتھوں اپنی مملکت تباہ کر دی۔ ہم نے اس قدر ذلت و رسوائی قبول کر لی۔ لیکن یہ سب کچھ ہم جھیل گئے۔ ہمیں جھیل جانا چاہیئے۔ اس جنگ میں جو شہید ہو گئے، ان پر بھی ہم نے صبر کر لیا۔ لیکن وہ لاکھوں بے بس انسان جو اس وقت ہمارے دشمن کے قبضہ میں ہیں، جب یہ خیال آتا ہے کہ ان پر کیا بیت رہی ہوگی، تو پھر یارائے ضبط نہیں رہتا۔ پھر بے ساختہ چیخیں نکل جاتی ہیں۔ ستر اسی ہزار کے قریب فوج، پولیس، سرحدی محافظ (رینجرز)۔ سول عملہ۔ اور وہ ہزارہا غیر بنگالی گھرانے جو وہاں آباد تھے۔ وہ سب اس ہندو کے قبضہ میں ہیں جس کی کمینگی کی کوئی حد نہیں اور اس کے ساتھ وہ "مکتی باہنی" جس کی انتقام جوئی درندوں کو بھی مات کر گئی ہے ... انہوں نے مارچ ۱۹۷۱ء میں جس جس قسم کے مظالم وہاں کی آبادی پر روا رکھے تھے، ان کی یاد سے

کلیجہ شق ہو جاتا ہے۔ اور یہ اُس وقت ہوا جب انہیں کوئی اختیار حاصل نہ تھا۔ اب جبکہ وہاں کی حکومت ان کے ہاتھوں میں ہے اور اسلحہ سے بھرے ہوئے ٹرک ان کے ساتھ، وہ ان بے دست و پا مظلوموں کے ساتھ جو کچھ کر رہے ہونگے، کونسا دل ہے جو اس کے تصور سے ٹکڑے نہ ہو جائے۔ بی۔ بی۔ سی کی خبر تھی کہ ڈھاکہ میں قانون اور حکومت نام کی کوئی چیز باقی نہیں۔ چیرہ دست فوجی اور غیر فوجی درندے، رائفلیں اور مشین گنیں ہاتھوں میں لئے شہر کے گلی کوچوں میں گھوم رہے ہیں، اور وہاں چیخ و پکار کے سوا کوئی آواز نہیں سنائی دیتی۔ ہم کہاں سے ایسا پُرسکون دماغ لائیں جو سوچ سکیں کہ ان حالات میں ہماری ماؤں، بہنوں، بیٹیوں پر کیا بیت رہی ہوگی۔ ہم کہاں سے وہ پتھر کا کلیجہ لائیں جو ہمیں یہ سمجھنے کی فرصت دے سکے کہ ہمارے معصوم بچے کس کس قسم کی سفاکی اور بلادی سے موت کے گھاٹ اتارے جا رہے ہونگے۔ اُف!

مرا اے کاشکے مادر نزادے

اور اس کے ساتھ اسے بھی پیش نظر رکھیئے کہ اگر وہاں ایک لاکھ افراد، دشمن کے قبضہ میں ہیں، تو اِدھر ان کے متعلقین کے ایک لاکھ گھرانے ایسے ہیں جو ان کے غم میں سر بزانو بیٹھے ہیں۔ اور ان کی یہ سوگواری ایسی سینہ سوز اور جگر گداز ہے جس میں نہ انسان جیتا ہے اور نہ مرتا ہی ہے۔ انہیں کچھ معلوم نہیں کہ ان کے عزیز زندہ ہیں یا شہید ہو چکے ہیں۔ انہیں کچھ معلوم نہیں کہ وہ اگر زندہ ہیں تو کہاں ہیں اور ان پر کیا گزر رہی ہے۔ انہیں کچھ معلوم نہیں کہ وہ زندہ واپس آ سکیں گے یا نہیں اور اگر آ سکیں گے تو کب تک! سوچیئے کہ یہ سیاہ پوش گھرانے کس کشمکش میں مبتلا ہیں اور کس ضیق میں سانس لے رہے ہیں۔ غالب نے شاید ایسے ہی جانکاہ حوادث کے سلسلہ میں کہا تھا کہ:

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شب غم بری بلا ہے
مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

اور یہی ہیں وہ جانکاہ اور ہوشربا مقامات جہاں ہر مظلوم یہ پوچھتا ہے کہ جن ظالموں، غداروں نے قوم کو یہ دن دکھلائے وہ تو دندناتے پھر رہے ہیں، بتلایئے کہ ہم نے کون سے گناہ کئے تھے جن کی پاداش میں ہمیں یہ مظالم برداشت کرنے پڑ رہے ہیں؟ اور یہی ہیں وہ حوادث جن کے سلسلہ میں قرآن نے متنبہ کیا تھا کہ وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاصَّةً ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (۸/۲۵)۔ اُس فتنے سے بچنے کی تدابیر اختیار کرتے رہو جو جب آتا ہے تو اس کی پیدا کردہ تباہیاں انہی لوگوں تک محدود نہیں رہا کرتیں جنہوں نے ظلم کئے تھے۔ وہ اپنی لپیٹ میں سب کو لے لیا کرتا ہے۔ یاد رکھو! خدا کے قانونِ مکافات کی گرفت بڑی شدید ہوتی ہے۔

ہم یہاں تک لکھ چکے تھے کہ اعلان ہوا کہ عسکری نظام کی جگہ، زمام اقتدار مسٹر بھٹو نے سنبھال لی ہے۔ ہم مملکتِ پاکستان کے اس نئے صدر کی خدمت میں بصد الحاح و زاری گزارش کریں گے کہ وہ دیگر تمام معاملات کو پس پشت ڈال کر ان مظلوموں کو، ان درندوں کے ہاتھوں سے چھڑانے کے لئے جو کچھ بھی بن پڑتا ہے کریں۔ اگر ان کے لئے زرِ فدیہ دینا پڑتا ہے تو قوم کو بتلایئے۔ یہ لٹی پٹی قوم بھی، اپنے اُن جگر گوشوں کو بچانے کی خاطر، کپڑوں تک اتار کر دے دیگی۔ یہ تو وہ مقام ہے جہاں خود خالقِ کائنات نے پکار پکار کر کہا تھا کہ وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ۔ اے مسلمانو! تمہیں کیا ہو گیا ہے

کہ ہم شمشیر بدست اٹھ نہیں کھڑے ہوتے! ہم سنتے نہیں ہو کہ مکہ میں دشمنوں کے نرغے میں گھرے ہوئے مظلوم مرد، عورتیں بچے کس طرح چیخ رہے اور ہمیں پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ رَبَّنَا اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا۔ اے ہمارے پروردگار! ہمیں اس بستی سے نکالنے کی کوئی صورت پیدا کر دے جس کے رہنے والے ہم پر اس قدر ظلم کر رہے ہیں۔ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا۔ اے ہمارے پروردگار! ہمارے لئے اپنی طرف سے کسی سرپرست کو بھیج۔ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيرًا۔ (پ ۵) کسی سے کہہ کہ وہ ہماری مدد کو پہنچے"۔ ہم اس وقت ایسے ہی جانگسل حادثہ سے دوچار ہیں۔ اس لئے ہم اربابِ اقتدار سے بار بار گزارش کریں گے کہ وہ اس باب میں کوئی عملی اقدام کریں۔ اور بہت جلد کریں۔ اُن بیکسوں اور بے بسوں پر ایک ایک لمحہ قیامت کا گزر رہا ہوگا۔ وہ بڑی بے بسی سے ہماری طرف تک رہے اور پکار پکار کر کہہ رہے ہونگے کہ

بہ لبم رسیدہ جانم، تو بیا کہ زندہ مانم
پس ازاں کہ من نمانم، بچہ کار خواہی آمد

اس کے ساتھ ہی ہم اپنے ادھر کے بھائیوں سے بھی ایک ضروری گزارش کرنا چاہتے ہیں۔ مغربی پاکستان میں، بہت سے بنگالی موجود ہیں۔ شدتِ جذبات میں کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ ان کے خلاف کسی قسم کی انتقامی کارروائی پر اتر آئیں۔ اسلام اس کی قطعاً اجازت نہیں دیتا۔ وہ ہمارے بھائی ہیں جب ہم مشرق اور مغرب میں کسی قسم کا امتیاز خلافِ اسلام قرار دیتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم بنگالی اور غیر بنگالی میں کسی قسم کی تمیز روا رکھیں۔ جیسا کہ ہم نے ابھی ابھی کہا ہے، یہ (بنگالی) ہمارے بھائی ہیں اس لئے ان کے ساتھ برادرانہ برتاؤ ہونا چاہیئے۔ اور چونکہ (بحالاتِ موجودہ) ان کے دل میں طرح طرح کے خیالات گزرتے ہونگے، اس لئے ضروری ہے کہ ان سے نہ صرف حسنِ سلوک ہی کریں، بلکہ انہیں اطمینان دلائیں کہ یہ ان کا اپنا گھر ہے اور یہاں ان کی ہر شے محفوظ ہے۔ وہ کسی قسم کا اندیشہ نہ کریں۔ البتہ ان کی نقل و حرکت پر نگہداشت ضرور رکھی جائے تاکہ ان میں اگر کوئی فتنہ جو عنصر ہے تو اسے کسی سازش کا موقعہ نہ مل سکے۔ یہ احتیاط اس لئے بھی ضروری ہے کہ اس جنگ کے دوران، بلکہ اس سے بھی بہت پہلے، سول اور فوج کے اکثر بنگالی عمال نے اس قسم کی غداری کی ہے، جس سے بنگالیوں پر سے بہ حیثیتِ مجموعی عوام کا اعتماد اٹھ گیا ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ منافق اور سازشی کے ملنے پر ایسا کچھ لکھا نہیں ہوتا جس سے اُسے مخلص انسانوں سے الگ کر لیا جائے۔ ضمناً، اور یہ احتیاط بنگالیوں تک محدود نہیں رکھنی چاہیئے۔ خود مغربی پاکستان کے باشندوں پر بھی ایسی نگاہ رکھنا ضروری ہے کہ یہاں بھی غداروں کی کمی نہیں۔ لیکن اس سلسلہ میں یہ بھی ضروری ہے کہ یونہی ایک دوسرے کو غدار قرار دیکر ملک میں ایک نیا فتنہ نہ کھڑا کر دیا جائے۔ احتیاط اور شے ہے۔ ناحق بدظنی اور شے۔

(۰)

یہ حادثہ تو ایسا تھا جس سے ہمارا جانبر ہونا مشکل نظر آتا تھا۔ لیکن غنیمت ہے کہ یہاں کم از کم ایک شخص ایسا موجود تھا جس پر عوام کو اعتماد ہے۔ ہماری مراد مسٹر بھٹو سے ہے۔ اب جبکہ زمامِ اقتدار اس کے ہاتھ میں آ گئی ہے، امید کی جا سکتی ہے کہ مفاد پرست گروہ عوام کو اپنا آلۂ کار بنا کر ہنگامے برپا نہیں کرا سکے گا اور یہ ملک خانہ جنگی سے بچ جائے گا۔ ان مفاد پرستوں کا ماضی قوم کے سامنے ہے۔ انہوں نے کبھی بھائی جمہوریت کی آڑ میں اور کبھی تحفظِ اسلام

کے نقاب میں ملک میں جو تباہیاں مچائی ہیں ان سے کون واقف نہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ وہ ان رہبر نما رہزنوں کی روباہ بازیوں سے محتاط رہیں۔ اس وقت دشمن کی فوجیں ہماری پوری کی پوری سرحد پر چھائی ہوئی ہیں۔ وہ (سردست) مشرقی پاکستان کی طرف سے فارغ ہو گیا ہے اس لئے اس کی طرف سے خطرہ اور بھی شدت اختیار کر رہا ہے۔ ان حالات میں نہایت ضروری ہے کہ ملک میں کسی قسم کی بدامنی نہ پھیلنے دی جائے۔ اس مقصد کے لئے ملک کے ہر بہی خواہ پر لازم ہے کہ وہ مسٹر بھٹو کے لئے وجہ تقویت بنے اور ان کے ہاتھ مضبوط کرے۔ ان کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ ملک کے ایسے اربابِ دانش و بینش اور اصحابِ تجربہ و صلاحیت جن کے نزدیک پاکستان کا تحفظ جزوِ ایمان ہے، مسٹر بھٹو کے مشیر ہوں۔ مسٹر بھٹو نے اپنی پہلی نشری تقریر میں اپنے اس ارادہ اور خواہش کا اظہار کیا ہے کہ وہ ملک (بلکہ بیرونِ ملک تک) کے اربابِ فہم و بصیرت کے مشوروں سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ اس لئے ایسے حضرات کو اپنی خدمات صاحبِ صدر کے تعاون کے لئے پیش کر دینی چاہئیں۔ یاد رکھیے!

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل اگر کوئی عمل دفتر میں ہے

(۲)

ہم نے شروع میں کہا ہے کہ اس المیۂ جانگداز کے کچھ اسباب تو عارضی اور ہنگامی ہیں اور کچھ حقیقی اور بنیادی ہنگامی اسباب کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ اس کے بعد ہم اس کی حقیقی اور بنیادی وجوہات کی طرف آتے ہیں جنہیں ہم نے علتِ مرض قرار دیا ہے۔ یہ علتِ مرض ایسی نہیں جس کی تشخیص ہم پہلے پہل کر رہے ہوں۔ یہ تو وہ دیرینہ بیماری ہے جس کا چرچا ہم پہلے دن سے کرتے چلے آ رہے ہیں اور جس سے قارئینِ طلوعِ اسلام بخوبی واقف ہیں۔ یہ علت العلل یہ ہے کہ ہم ایک قوم نہیں بن سکے لیکن اپنے آپ کو دھوکا دیتے چلے جا رہے ہیں کہ ہم ایک قوم ہیں۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ہم نے تحریکِ پاکستان کے دوران یہ دعویٰ کیا کہ اسلام کی رُو سے قومیت کی بنیاد دین کا اشتراک ہے نہ کہ وطن کا اشتراک۔ یہی دعویٰ ہمارے مطالبۂ پاکستان کی بنیاد تھی اور اسی کی بنا پر ہم نے اس خطۂ ارض کو حاصل کیا۔ مطالبۂ پاکستان کے مدعی، اس دعوے میں متفق اور ہم آہنگ تھے اور اسی ہم آہنگی اور یکجہتی کی بنا پر ان میں وحدت پیدا ہو گئی تھی۔ اس وحدت میں، بنگالی اور غیر بنگالی۔ اور غیر بنگالیوں میں بلوچی، سندھی، پنجابی، پٹھان سب شامل تھے۔ لیکن اس کے باوجود یہ ایک قوم نہیں بن گئے تھے اور اس کی ایک خاص وجہ تھی۔

وطن کی بنیاد پر قوم بنانی نہیں پڑتی۔ قوم بنی بنائی ہوتی ہے۔ جونہی آپ نے کسی ایک خطۂ زمین میں مملکت کی تشکیل کی، اس میں بسنے والے تمام افراد ایک قوم بن گئے۔ اس کے بعد، اس قوم میں پیدا ہونے والے بچے، پیدائشی طور پر اس قوم کے فرد بنتے چلے گئے۔ لہٰذا اس بنیاد پر قومیت کی تشکیل کے لئے کچھ کرنا نہیں پڑتا لیکن جب آپ نظریہ (ایمان) کے اشتراک کو قومیت کی بنیاد قرار دیں تو آپ کو بنی بنائی قوم نہیں مل جاتی۔ یہ قوم بنانی پڑتی ہے۔ اس کے لئے مناسب تعلیم و تربیت سے ان افراد کے دل میں "ایمان اتارنا پڑتا ہے"۔ ہم نے "ایمان اتارنا پڑتا ہے" کے الفاظ یونہی نہیں لکھ دیئے۔ یہ ایک عظیم قرآنی حقیقت کا تبیان ہے۔ قرآن کریم ان لوگوں کو جو زبان سے ایمان کا اقرار کرتے ہیں لیکن ایمان ان کے دل کی گہرائیوں میں نہیں اترا ہوتا، مومن قرار نہیں دیتا۔ حتیٰ کہ وہ ان

سے کہتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو مومن کہیں بھی نہ۔ ان کے لئے وہ ایک اور اصطلاح استعمال کرتا ہے۔ سورۂ حجرات میں ہے۔ قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا - یہ بدوی قبائل کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں۔ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا۔ کہا کہ ان سے کہو کہ تم ایمان نہیں لائے۔ وَلٰکِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا۔ تم یوں کہو کہ ہم اسلامی نظام کے سامنے جھک گئے ہیں۔ اس لئے کہ وَلَمَّا یَدْخُلِ الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِکُمْ۔ (۴۹/۱۴) اس وقت ایمان تمہارے دل میں نہیں اترا۔ اس کی گہرائیوں میں داخل نہیں ہوا۔ اس کے بعد قرآن کریم نے بتایا ہے کہ یہ مومن کہلانے کے مستحق کس طرح اور کب ہوں گے۔ واضح رہے کہ یہ لوگ کفار کے زمرے میں شامل نہیں ہوتے۔ ان سے الگ ہو جاتے ہیں۔ یوں سمجھئے کہ یہ اسلامی قومیت کے افراد بننے کے لئے (PROBATIONERS) ہوتے ہیں۔ انہیں مناسب تعلیم و تربیت اور اطاعت قوانین خداوندی سے مومن بنایا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کی تعلیم و تربیت اور تطہیر فکر و نظر کا کام بڑا محنت طلب ہوتا ہے۔ حضور نبی اکرم کے متعلق جو بار بار کہا گیا ہے۔ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ وَیُزَکِّیْھِمْ۔ کہ وہ انہیں قوانین خداوندی اور ان کی علت و غایت کی تعلیم دیتا ہے۔ اور ان کی انسانی صلاحیتوں کی نشوونما کرتا ہے تو یہ قومیت (امت) سازی کا پروگرام ہی تھا۔

اس پروگرام میں یہ بھی نہیں ہوتا کہ آپ نے ایک نسل کو مومن بنانے کے بعد اسلامی قومیت کے افراد بنا لیا تو اس کے بعد یہ سلسلہ خود بخود آگے چلتا گیا۔ قطعاً نہیں۔ اس کے لئے، ہر نومولود کو اسی طرح مومن (یعنی اس قوم کا فرد) بنانا پڑتا ہے۔ اس طرح اسلامی قومیت کا سلسلہ آگے بڑھتا ہے۔ جس مقام پر بھی آپ نے اس پروگرام کو منقطع کر دیا اسلامی قومیت کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ مسلمانوں کے ساتھ یہی کچھ ہوا تھا۔ صدر اول میں اس پروگرام کے ماتحت امت مسلمہ کی تشکیل ہوئی۔ جب تک آنے والی نسلوں کو تعلیم و تربیت کے قرآنی پروگرام کے مطابق، اس امت کا فرد بنانے کا پروگرام جاری رہا، امت وجود میں رہی۔ جب یہ پروگرام منقطع ہو گیا، تو ایمان کے اشتراک کی بنا پر قوم کا وجود باقی نہ رہا۔ پھر نسل اور وطن قومیت کا معیار قرار پا گئے۔ چنانچہ آج دنیا میں جس قدر مسلمان آباد ہیں ان کا شمار اَسْلَمْنَا کی (CATEGORY) میں ہوتا ہے۔ اٰمَنَّا کی (CATEGORY) میں نہیں۔ اس لئے ان کا معیار قومیت نسل ہے یا وطن ——— اشتراکِ ایمان نہیں۔

تحریک پاکستان درحقیقت قرآنی معیار قومیت کے احیاء کی انقلابی آواز تھی۔ یہ آواز چونکہ حقیقی اسلام کی صدائے بازگشت تھی اور تحریک کا نصب العین بڑا واضح تھا، اس لئے قوم اس آواز پر ایک مرکز کے گرد جمع ہو گئی اور یوں ان کے متحدہ مطالبہ پر پاکستان وجود میں آ گیا۔ جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں، اس وحدت مقصد سے قوم میں وحدت پیدا ہو گئی تھی لیکن ایمان کی بنیادوں پر قوم بنی نہیں تھی۔ اس خطۂ ارض میں اس قسم کی قوم کو متشکل کرنا تھا۔ طلوع اسلام نے کہ جو تحریک پاکستان کا نقیب تھا، یہاں آتے ہی یہ کہا کہ قوم کے موجودہ افراد کے ذمہ تو یہ فریضہ عاید کیجئے کہ وہ اس خطۂ ارض کی حفاظت کرتے رہیں اور نئی نسل کی تعلیم و تربیت کا ایسا انتظام کیجئے جس سے ایمان ان کے دل کی گہرائیوں میں داخل ہو جائے اور اس طرح وہ امت وجود میں آ جائے جو قرآن کا منتہا اور تحریک پاکستان کا مطلوب و مقصود تھا۔ لیکن اس آواز پر کسی نے کان نہ دھرا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ ہماری نئی نسل افراد کا مجموعہ بن کر رہ گئی۔ مغربی پاکستان میں تو یہ نسل قرآنی نظریہ سے صرف بیگانہ رہی لیکن مشرقی پاکستان میں ان پر خصوصیت سے منفیانہ اثر غالب ہوتا چلا گیا۔

وہاں ہندوؤں نے ڈیرے ڈال دیئے اور مسلمانوں کی تعلیم کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس تعلیم کے ذریعے انہوں نے نسلی اور وطنی تعصبات کو بڑی شدت سے ابھارا۔ وہاں کی نئی نسل کے دل میں یہ تعصبات کس حد تک شدت اختیار کر گئے تھے، اس کا اندازہ ایک واقعہ سے لگ سکتا ہے۔ تشکیلِ پاکستان کے پانچ چھ برس بعد کی بات ہے کہ پرویز صاحب مملکت پاکستان کے اس بازو کا براہِ راست مطالعہ کرنے کے لئے مشرقی پاکستان گئے اور بڑے مایوس لوٹے۔ اس سلسلے میں وہ ایک واقعہ کا ذکر اکثر کیا کرتے ہیں۔ اس زمانے میں وہاں اردو، بنگالی کا قضیہ بڑی شدت اختیار کر چکا تھا لیکن ان کے پیغام کی کشش کا یہ عالم تھا کہ ڈھاکہ کے طلباء ان کی تقریر سننے کے بے حد مشتاق تھے خواہ وہ اردو ہی میں کیوں نہ ہو۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک شام (میں) طلباء کے ایک جلسے میں تقریر کرنے کے لئے جا رہا تھا تو ایک معزز قدیم بنگالی علم دوست بزرگ نے جو میرے میزبان کے قریبی دوست تھے، مجھے ایک طرف لے جا کر کہا کہ آپ تقریر کے لئے جا تو رہے ہیں لیکن میری ایک بات دل کے کانوں سے سنیئے۔ اور وہ یہ کہ اگر وہاں کہیں حضور نبی اکرمؐ کا ذکر آ جائے تو یہ نہ کہیئے گا کہ وہ بنگالی نہیں تھے۔ پرویز صاحب کہتے ہیں کہ اس ایک کلیدی نکتہ نے ان کے مطالعہ اور مشاہدہ کا رخ بدل دیا اور وہ یہ نتیجہ لے کر واپس آئے کہ وہ حصہ ہمارے ساتھ اسی صورت میں رہ سکتا ہے کہ ہندوؤں کے ہاتھوں سے تعلیم کا نظام ایک قلم چھین کر اسے یکسر بدل دیا جائے۔ انہوں نے اپنے حاصل مطالعہ کو یہاں کے ذمہ دار ارباب تک بھی پہنچا دیا تھا لیکن انہوں نے بھی اسے اَن سنی کر دیا اور وہاں کی تعلیم بدستور ہندوؤں کے ہاتھ میں رہی۔ نتیجہ اس کا یہ تھا کہ ۱۹۵۴-۵۵ء میں اگر وہاں کا مسلمان نوجوان غیر بنگالی رسول قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھا تو ۱۹۷۱ء کا ڈھاکہ یونیورسٹی کا ایم۔ اے کا سٹوڈنٹ عزیز الرحمٰن اس کا کھلے بندوں اعلان کر رہا تھا کہ پاکستان نے ان پر ظلم کیا ہے کہ ان کے اپنے بھگوان کو ان سے چھڑا کر ان پر ایک بدیشی خدا (اللہ) مسلط کر دیا ہے۔ (عزیز الرحمٰن کا یہ مضمون طلوع اسلام میں شائع ہو چکا ہے)

یہ تھے مشرقی پاکستان کے کوائف جن کی بنا پر طلوع اسلام نے ۱۹۵۳ء میں یہ کہہ دیا تھا کہ مغربی اور مشرقی پاکستان کا ایک وحدت بن کر رہنا مشکل نظر آتا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ انہیں دو وحدتیں تسلیم کر کے ان میں کنفیڈریسی پیدا کر دی جائے۔ یہ تجویز ہم نے طلوع اسلام بابت اکتوبر ۱۹۵۳ء کے لمعات میں پیش کی تھی۔ اس میں اس حقیقت کی وضاحت کے بعد کہ ہم نے پاکستان کے مسلمانوں کو ایمان کے اشتراک کی بنا پر ایک قوم بنانے کے سلسلہ میں کچھ نہیں کیا، یہ لکھا گیا تھا کہ

وہ آپ جذبات سے الگ ہٹ کر اپنے دل سے پوچھیئے کہ جو کچھ ہم نے اوپر لکھا ہے وہ حقیقت ہے یا نہیں۔ آپ اپنے دل سے پوچھیئے کہ کیا آج بنگالی اور غیر بنگالی، سندھی اور پنجابی، سرحدی اور بلوچستانی فی الواقعہ ایک ایسی ملی حیثیت اختیار کر چکے ہیں، جیسے پانی کے قطرے دریا میں مل کر قطرے باقی نہیں رہتے دریا بن جاتے ہیں، یا ان میں سے ہر ایک اپنے آپ کو دوسرے خطے کے مسلمانوں سے الگ تصور کرتا ہے؟ اگر آپ کا دل اس کی گواہی دیتا ہے کہ پاکستان میں مختلف صوبوں کے مسلمان ایک دوسرے کے اندر اس طرح جذب نہیں ہو سکے کہ وہ باہمی ادغام سے ایک ملت بن چکے ہوں تو پھر سوچیئے کہ اس حقیقت سے آنکھیں بند کر کے پاکستان کے مسائل کا حل سوچنا کوئی مفید نتیجہ مرتب کر سکتا ہے؟ یہ ہے سب سے بڑی وجہ اس امر کی کہ ہم اس وقت تک آئین سازی کے سلسلہ میں بھی ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکے۔

"طلوع اسلام نے اس حقیقت کا احساس کرنے کے بعد (اپنے پیش کردہ مسودہ آئین میں) یہ تجویز کیا تھا کہ پاکستان میں فیڈرل گورنمنٹ قائم کرنے کے بجائے وحدانی حکومت قائم کرنی چاہیئے۔ فیڈرل حکومت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مختلف صوبے

اپنی اپنی جگہ مستقل حیثیت رکھتے ہوئے خود مختار وحدتیں تسلیم کئے جائیں۔ ان کی اپنی اپنی مجالس مقننہ ہوں اور اپنی اپنی وزارتیں اور حکومتیں۔ مرکز میں صرف وہ امور رکھے جائیں جن کا تعلق تمام صوبوں سے مشترک طور پر ہو۔ اس کے برعکس وحدانی حکومت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ پورے ملک کو ایک وحدت تصور کر کے صرف ایک مرکزی حکومت قائم کی جائے اور صوبوں کی حدود بندی کو مٹا دیا جائے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اگر اس تجویز پر شروع ہی میں عمل کر لیا جاتا تو آج مختلف خطوں کے درمیان بُعد و افتراق کی یہ صورت کبھی پیدا نہ ہوتی۔ لیکن ہمارے خیال میں اب صورتِ حالات ایسی پیدا ہو چکی ہے کہ وحدانی انداز کی حکومت بھی شاید کامیاب نہ ہو سکے اس لئے اب ہماری تجویز یہ ہے کہ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کو دو خود مختار وحدتیں تسلیم کر کے ان میں کانفڈریسی پیدا کر دی جائے جس میں تراضی مابین سے مشترک مسائل اکٹھے رکھ لئے جائیں۔ اس کے ساتھ ہی مغربی پاکستان کے تمام صوبوں کو مٹا کر پورے ملک میں ایک حکومت قائم کی جائے۔

"اس تجویز کے خلاف جذبات پرست طبقہ یہ کہہ کر شور مچا دیگا کہ دیکھئے ملت کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کیا جا رہا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ملت کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کرنا بہت بڑا جرم ہے۔ آپ خیال کیجئے کہ جس طلوعِ اسلام کے سامنے نصب العین یہ ہو کہ تمام دنیا کے مسلمانوں کو ملتِ واحدہ بنا کر ان میں ایک حکومت قائم کی جائے۔ نہیں! اس سے بھی ایک قدم اور آگے جس کا منتہائے نگاہ یہ ہو کہ تمام نوعِ انسانی کے لئے قرآن کی روشنی میں واحد نظام قائم کیا جائے، وہ طلوعِ اسلام خود اپنی قریب ترین ملت کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کرنے کی سفارش کس طرح کر سکتا ہے؟ لیکن جب واقعہ یہ ہو کہ وہ ملت ایک ملت بنی ہی نہیں بلکہ کئی ملتوں میں منقسم ہے تو پھر طلوعِ اسلام کی مذکورہ تجویز، ایک ملت کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کرنا نہیں بلکہ ایک حقیقت کا اعتراف ہے اور اس اعترافِ حقیقت کے بعد ایسا عملی حل جس سے ان دونوں ٹکڑوں کی درمیانی خلیج اس حد تک وسیع ہونے سے بچ جائے گی جس حد تک وسیع ہونے کا بحالاتِ موجودہ خطرہ ہے۔ ہم مسلسل چھ برس سے پکارتے چلے آ رہے ہیں کہ خدا کے لئے کوئی ایسی صورت پیدا کیجئے جس سے پاکستان میں صوبائی امتیاز کا احساس ختم ہو جائے۔ لیکن جب یہ صورت پیدا نہیں کی گئی تو اس کے بعد اس پیچیدہ مسئلہ کا حل اس کے سوا اور کوئی نظر نہیں آتا کہ حقائق کا اعتراف کر کے ایک ایسی صورت پیدا کر لی جائے جس سے مختلف خطوں کے پاکستانیوں میں خوشگوار تعلقات تو قائم رہیں۔"

آپ غور فرمائیے کہ جب وہاں ۵۳ء میں یہ حالت تھی تو ۷۱ء میں جو کچھ ظہور میں آیا وہ کس طرح غیر متوقع یا موجبِ تعجب قرار پا سکتا ہے؟ یہ فطری نتیجہ تھا ہمارے مجرمانہ تغافل نہیں بلکہ دیدہ دانستہ تسامح کا۔ اور یہی ہیں ہمارے وہ اجتماعی جرائم جو آج مجیب اور اس کے نوجوان رفقاء کی غداری اور آخر الامر ہماری موجودہ ذلت و رسوائی پر منتج ہوئے ہیں۔ یہ لوگ اب اس مقام پر پہنچ چکے ہیں اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ سقوطِ ڈھاکہ کے بعد نام نہاد بنگلہ دیش کے مجوزہ (قائمقام) صدر مسٹر نذرالاسلام نے جو تقریر نشر کی (بی۔ بی۔ سی کے ریڈیو کے مطابق) اس کا ملخص یہ تھا کہ:

ہماری یہ فتح نہ کسی فوج کی فتح ہے نہ کسی ملک کی۔ یہ فتح ہے حق کی باطل پر۔ یہ فتح ہے ایک صحیح نظریہ کی ایک غلط نظریہ پر۔ تقسیم ہند سے پہلے، سرحد پار کے مسلمانوں نے یہ دعویٰ کیا کہ قومیت کا معیار مذہب کا اشتراک ہے۔ وطن کا اشتراک نہیں۔ اور حکومت کی بنیاد دین پر ہے، سیکولر نہیں۔ وہاں ان لوگوں کو لاکھ سمجھایا گیا کہ یہ نظریہ غلط ہے اور ناممکن العمل۔ اس پر اصرار نہ کرو۔ لیکن وہ نہ مانے اور اپنے اس غلط مفروضہ کی بنا پر ایک جداگانہ قوم بن کر ایک الگ مملکت کے بانی بن گئے۔ لیکن چوبیس سال کے تجربہ نے ثابت کر دیا کہ جو نظریہ

یہ لوگ پیش کر رہے تھے وہ باطل تھا۔ اور حق وہی تھا جسے ان کے مخالفین پیش کر رہے تھے۔ سقوطِ ڈھاکہ نے اس حقیقت پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی۔ اب یہ شہادت تاریخ کے صفحات پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے منقوش رہے گی۔ ہم ان راہ گم کردہ لوگوں سے اب بھی کہیں گے کہ وہ اس باطل نظریہ کو ترک کر کے وطن کے اشتراک کی بنا پر پھر سے ہندوستانی قوم کا جزو بن جائیں اور مذہب کو سیاست میں گھسیٹنے کی کوشش نہ کریں۔ ورنہ جو حشر آج مشرقی پاکستان کا ہوا ہے وہی کل کو مغربی پاکستان کا بھی ہوگا۔ حقائق کسی کے جھٹلانے سے جھوٹے ثابت نہیں ہو جایا کرتے[1]

سوچئے کہ کیا یہ وہی مؤقف نہیں جسے تقسیمِ ہند سے پہلے ہندوؤں نے، مطالبۂ پاکستان کی مخالفت میں اختیار کیا تھا۔ یہ لوگ آج بعینہٖ اسی مقام پر کھڑے ہیں جہاں اس زمانے میں ہندو تھے، اور آج تک ہیں۔

یہ لوگ، اہلِ پاکستان کو مشورہ دیتے ہیں کہ وہ دو قومی نظریہ کو خیرباد کہہ کر، وطنیت کی بنیادوں پر ہندو قومیت کا جزو بن جائیں۔ حیرت ہے کہ یہ لوگ پاکستان کی مخالفت کے جذبہ سے اس قدر اندھے ہو چکے ہیں کہ انہیں اتنا بھی نظر نہیں آتا کہ جو (بدنصیب) مسلمان اس وقت ہندوستان میں بستے ہیں، ہندوؤں کے ہاتھوں ان کا کیا حشر ہو رہا ہے۔ لیکن ان کی آنکھوں سے اس پٹی کے اترنے میں کچھ زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد انہیں معلوم ہو جائے گا کہ جن ہندوؤں کے ساتھ مل کر وہ ایک قوم بننے کے خواب دیکھ رہے ہیں، ان کے ہاتھوں ان کا بھی کیا حشر ہوتا ہے۔ شیخ عبداللہ کی مثال ساری دنیا کے سامنے ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو انہیں اپنا بھائی کہتا تھا۔ اور اندرا گاندھی انہیں چچا جان کہہ کر پکارتی تھی۔ لیکن اس نے انہیں جس طرح چچا بنا کر چھوڑا ہے وہ ہر دیدہ بینا کے لئے سامانِ ہزار عبرت اپنے اندر رکھتا ہے۔ مشرقی پاکستان کی جس قدر تباہی ہو چکی ہے اس کی تعمیرِ نو کے لئے کروڑوں نہیں، اربوں روپے درکار ہونگے۔ اول تو ہمیں امید نہیں کہ ہندوستان اس کمرشکن بوجھ کو اٹھانے کے لئے آمادہ ہو جائے۔ لیکن اگر اس نے ان لوگوں کو کسی حد تک بھی امداد دی تو اس کے عوض وہ اس سوختہ بخت ملک کو گروی رکھ لینگے اور تھوڑے ہی عرصہ کے بعد ان لوگوں کی حالت شودروں سے بھی بدتر ہو جائے گی۔ مغربی پاکستان والوں کی انتہائی کوشش تھی کہ مشرقی پاکستان کے بنگالی ہندو کی غلامی سے بچ جائیں۔ اس کے لئے انہوں نے اپنا خون تک بہا دیا۔ لیکن وہ اس حد تک خودکشی پر تلے بیٹھے تھے کہ ہماری کوئی کوشش بھی انہیں اس سے بچا نہ سکی۔ ہمیں ان کی حالت پر ترس ضرور آتا ہے۔ لیکن دیدہ و دانستہ زہر کھانے والے کو موت سے کون بچا سکتا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ مجیب کے ساتھ گفتگو سے مصالحت کی جو تجویزیں ہو رہی ہیں وہ مشرقی پاکستان میں محبوس ہماری فوج اور سول آبادی کے ادھر منتقل کرنے تک محدود رہینگی اور ایسی صورت نہیں پیدا ہونے دی جائیگی جس سے ہمیں مجیب کے ہاتھوں پھر سے وہ خطرہ لاحق ہو جائے جس سے ہم ۱۹۷۱ء میں کسی نہ کسی طرح بچ گئے تھے، اور مزید برآں یہ کمرشکن بوجھ بھی ہم پر آ پڑے۔ اب تو انہیں ہندوؤں کی سرپرستی کا مزہ چکھ ہی لینے دینا چاہیئے۔ اُس وقت یہ لوگ اس موڈ میں ہونگے کہ کوئی معقول بات سن سکیں۔

بہرحال یہ ہے نتیجہ پاکستان کے اربابِ حل و عقد کی اس مجرمانہ کوتاہی کا کہ مناسب تعلیم و تربیت سے نظریۂ پاکستان

---

[1] اندرا گاندھی نے بھی بھارتی پارلیمان میں اسی قسم کی تقریر کی تھی۔

کو ان نوجوانوں کے دل میں نہ اتارا گیا۔ اس سے وہ خود بھی تباہ ہوئے اور اس کے ساتھ پاکستان کو بھی تباہ کیا۔

اس مقام پر ضمناً واضح کر دیا جائے کہ یہ کیفیت مشرقی پاکستان ہی کی نہیں، خود مغربی پاکستان میں بھی ہم نے نئی نسل کو ایمان کے اشتراک کی بنا پر ایک قوم کی وحدت میں تبدیل کرنے کے لئے کچھ نہیں کیا۔ یہاں کا نظامِ تعلیم بھی علی الہالہ چلا آرہا ہے۔ یہاں بچت یہ ہے کہ یہ پورا علاقہ (مشرقی بنگال کی طرح) ایک نسل پر مشتمل نہیں۔ یہاں مختلف نسلیں آباد ہیں جو صوبوں کی حدود میں گھری ہوئی ہیں۔ اس لئے یہاں بنگالی اور غیر بنگالی کا تو سوال نہیں، لیکن بلوچی، سندھی، پنجابی، پٹھان کا مسئلہ ویسا ہی نازک ہے اور ان کے باہمی تعصبات بھی ویسے ہی شدت اختیار کر رہے ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے بہت پہلے کہا تھا کہ ؎

ملک ہاتھوں سے گیا ملت کی آنکھیں کھل گئیں

اور ملت کی یہ آنکھیں پاکستان کے معمارِ اول سرسید نے کھولی تھیں جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہمیں ۱۹۴۷ء میں پھر سے ایک ملک حاصل ہو گیا۔ لیکن اس کے بعد ملت نے پھر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اب پھر ملک ہاتھوں سے چلا گیا ہے۔ خدا کرے کہ اس سے ملت کی آنکھیں دوبارہ کھل جائیں اور ہم چوبیس پچیس سال کے بعد ہی سہی مغربی پاکستان میں نئی نسل کی تعلیم کا صحیح انتظام کر دیں جس سے ایک ایسی قوم وجود میں آجائے جس میں وجہ جامعیت ایمان کا رشتہ ہو۔

یاد رکھئے، جو ملت ایمان کے رشتے کی بنا پر وجود میں آتی ہے، اس میں نہ کوئی غدار پیدا ہو سکتا ہے اور نہ دنیا کی کوئی طاقت اسے شکست دے سکتی ہے۔ ہم چونکہ ایمان کی لذت سے محروم ہیں اس لئے ہمیں اندازہ ہی نہیں کہ اس سے اس انگارۂ خاکی میں کس قدر محیر العقول توانائیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

لیکن اس سلسلے میں یہ نہایت ضروری ہے کہ ہم قرآن کے عطا کردہ ایمان کے تصور اور مروجہ اسلام میں جو بنیادی فرق ہے، اسے اچھی طرح سمجھ لیں۔ اس لئے کہ ہماری موجودہ تباہی کا ایک بنیادی سبب یہ بھی ہے کہ ہم نے مروجہ اسلام کو قرآنی اسلام سمجھ رکھا ہے۔ اس خود فریبی کا نتیجہ تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ پچھلے دنوں ملک میں یہ شکایت عام ہو گئی تھی کہ مریضوں کے لئے نہایت مناسب دوائیاں تجویز کی جاتی ہیں لیکن ان کے اثرات الٹے مرتب ہوتے ہیں۔ تحقیقات کے بعد پتہ چلا کہ ان دواؤں کے نام بھی وہی ہیں، شکل و صورت بھی وہی ہے لیکن ان میں اصلی جزو کوئی بھی نہیں۔ بلکہ تریاق کی جگہ زہر بھرا ہوا ہے۔ یہی صورت قرآنی اسلام اور مروجہ اسلام کی ہے۔ اس سلسلے میں ویسے تو ہم اکثر و بیشتر لکھتے چلے آئے ہیں۔ لیکن ستمبر ۱۹۷۰ء کے طلوع اسلام میں ایک مقالہ شائع ہوا تھا جس کا عنوان تھا "یہ آئینہ ہے"۔ اس کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔

"وہ آپ نے اس قسم کے نام اکثر سنے ہونگے — قاضی احمد اللہ۔ مفتی سعید الرحمٰن حکیم احمد حسن — نام یہ عام ہیں لیکن آپ کو معلوم ہے کہ ان میں سے نہ کوئی قاضی ہوتا ہے نہ مفتی نہ حکیم۔ ان کے بزرگوں میں سے کوئی ایسا تھا اور اس خصوصیت کی بنا پر ان کی شہرت تھی۔ وہ دنیا سے چلے گئے اور ان کے اہل خاندان نے یہ خصوصیت اپنے نام کا جزو بنا لی حتیٰ کہ بعض شہروں میں محلہ قاضیاں، مفتیاں محلہ بازار حکیماں بھی ہوتے ہیں۔ لیکن نہ ان محلوں میں کوئی قاضی یا مفتی ہوتا ہے نہ ان بازاروں میں کوئی حکیم۔ کسی زمانے میں وہاں ان خصوصیات کے حامل رہتے ہونگے۔ وہ ختم ہو گئے لیکن ان محلوں اور بستیوں کے نام اسی طرح متوارث چلے آتے ہیں۔

اب فرض کیجئے کہ تپ دق کا کوئی مریض حکیم احمد حسن "سبزی فروش" کے پاس چلا جائے اور وہ بھی اسے کچھ ٹوٹکے بتا دے۔ مریض کی وفات ہو جائے اور اس پر اس کے لواحقین کہنا شروع کر دیں کہ حکمت (طبِ یونانی) میں تپ دق کا کوئی علاج نہیں، ہم نے آزما کر دیکھ لیا ہے۔ تو فرمائیے، ان کا یہ فیصلہ کہاں تک مبنی بر حقیقت ہوگا۔ حکیم تو وہ ہوگا جس نے باقاعدہ حکمت (طب) پڑھی ہو اور اس کے مطابق طبابت کرتا ہو۔ مگر یہ اطبّاء طبابت کے اصولوں کے مطابق علاج کریں اور تپ دق پر قابو نہ پا سکیں تو پھر آپ کہہ سکتے ہیں کہ طبِ یونانی، تپ دق کے علاج سے قاصر ہے۔ اس سبزی فروش کے علاج کی ناکامی سے جس کا محض خاندانی نام "حکیم" ہے، طبِ یونانی کو مورد الزام ٹھہرانا کس طرح صحیح قرار پا سکتا ہے؟

جو غلطی تپ دق کے اس مریض اور اس کے متعلقین نے کی تھی، اسلام کے متعلق بعینہٖ وہی غلطی ہم کرتے ہیں۔ ہم نے اسلام اور مسلمانوں کو مرادف سمجھ لیا ہے اور مسلمانوں کی ناکامی کو اسلام کی ناکامی قرار دیدیتے ہیں .....

..... ہماری بنیادی غلطی یہ ہے کہ ہم نے اسلام اور مسلمانوں کو مرادف سمجھ رکھا ہے۔ قرآن کچھ ابدی قوانین دیتا ہے جن کے متعلق اس کا دعویٰ یہ ہے کہ جب اور جہاں بھی ان قوانین پر عمل کیا جائے گا، فلاں قسم کے نتائج مرتب ہو جائینگے۔ صدرِ اول میں ایک جماعت نے ان قوانین پر عمل کیا اور اس کے نتائج ساری دنیا کے سامنے آگئے۔ اس جماعت کا نام جماعتِ مومنین (یا عرفِ عام میں مسلمان) تھا۔ اس کے بعد اس جماعت کی نسل آگے بڑھی۔ انہوں نے ان قوانین پر عمل کرنا چھوڑ دیا لیکن نام اپنا اپنے اسلاف کی تقلید میں مسلمان ہی رکھا — بعینہٖ جس طرح احمد حسن سبزی فروش نے اپنا نام حکیم احمد حسن رکھ چھوڑا تھا۔ ظاہر ہے کہ ان "مسلمانوں" کا معاشرہ ان انسانیت ساز نتائج سے ہم آغوش نہیں ہو سکتا تھا جو ان قوانین پر عمل پیرا ہونے سے مرتب ہوتے تھے۔

اس سے یہ حقیقت بھی سامنے آجاتی ہے کہ امت کے اصلاحِ حال کی جس قدر کوششیں کی جاتی ہیں وہ ناکام کیوں رہتی ہیں؟ اس لئے کہ ہم چاہتے یہ ہیں کہ مسلمان جیسے ہیں ویسے کے ویسے ہی رہیں لیکن ہمارے وعظ سے ان کے معاشرہ میں اسلامی نظامِ زندگی کے نتائج ظہور میں آنے شروع ہو جائیں۔ ایسا سمجھنا بھی غلط ہے اور اس مفروضہ پر کوئی کوشش کرنا بھی لاحاصل۔"

یہی وہ خود فریبی اور غلط فہمی ہے جس میں ہم داخلی طور پر بھی مبتلا چلے آرہے ہیں اور خارجی طور پر بھی۔ "داخلی طور پر" کا شدید ترین مظاہرہ ہم حال ہی میں دیکھ چکے ہیں۔ مشرقی پاکستان کے مسلمان، مروجہ اسلام کے، مغربی پاکستان کے مسلمانوں سے بھی زیادہ پابند تھے۔ لیکن اس کے باوجود ان دونوں میں جو باہمی تعلق تھا وہ ابھر کر سامنے آگیا۔ اسی خود فریبی کا نتیجہ تھا کہ جنگ کے دوران منبر و محراب سے یہ غلط انداز آوازیں اٹھتی رہیں کہ غالب اور کامیاب ہمیں ہونگے کیونکہ خدا کا ارشاد ہے کہ وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ۔ (۳/۱۳۹) مت خوف کھاؤ، مت گھبراؤ۔ غالب اور کامیاب تمہیں ہوگے۔ کہیں سے آواز بلند ہوتی کہ ہندو کافر ہم پر کبھی غالب نہیں آسکتا کیونکہ خدا کا وعدہ ہے کہ وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا۔ (۴/۱۴۱) اللہ کبھی کافروں کو مومنوں پر غلبہ عطا نہیں کریگا۔ کبھی نعرۂ تکبیر کے بعد یہ آواز بلند کی گئی کہ خدا کی نصرت ہمارے ساتھ ہے کیونکہ اس کا ارشاد ہے کہ وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ (۳۰/۴۷) مومنوں کی مدد کرنا ہم پر فرض ہے۔ کبھی یہ کہا گیا کہ خدا کافروں کو ضرور ذلیل کرے گا۔

کیونکہ اس کا وعدہ ہے کہ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ۔ (۶۳/۸) عزت سب کی سب اللہ اور اس کے رسول اور مومنین کے لئے ہے۔ وَاِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ (۳۰/۶۰) اور خدا کے وعدے سچے ہیں اس لئے یہ ہو نہیں سکتا کہ ہم غالب نہ آئیں اور دشمن ذلیل نہ ہو۔ اس قسم کی آیات اور اس کے ساتھ اقبال کے ولولہ انگیز اشعار کہ

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں!

یہ حضرات اس قسم کے وعظ سنانے کے بعد اب حجروں میں جا چھپے اور نوجوان طبقہ پوچھتا پھرتا ہے کہ کہاں گئے تمہارے خدا کے وعدے! اب انہیں کون بتلائے کہ خدا کے وعدے تو سچے تھے لیکن اس نے یہ وعدے ہم سے نہیں کئے تھے "مومنین" سے کئے تھے۔ اس نے جب کہا تھا کہ وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ۔ تو اس کے ساتھ ہی یہ شرط بھی لگا دی تھی کہ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۔ (۳/۱۳۸) تم غالب رہو گے اگر تم مومن ہوتے۔ تو ہماری خود فریبی یا ابلہ فریبی یہ ہے کہ ہم اپنے آپ کو از خود مومن قرار دے لیتے ہیں اور خدا کے ان وعدوں کا اطلاق اپنے اوپر کر لیتے ہیں اور جب یہ وعدے پورے نہیں ہوتے تو پھر ہم اپنے ساتھ اسلام کو بھی بدنام کرتے ہیں۔ اگر ہم اتنا سمجھ لیں کہ مروجہ اسلام کی پابندی سے ہم خود ساختہ مومن تو بن سکتے ہیں خدا کے معیار کے مطابق مومن نہیں بن سکتے، اس لئے ہم خدا کے وعدوں کے مستحق نہیں قرار پا سکتے۔ تو نہ ہمیں شرمسار ہونا پڑے نہ ہماری وجہ سے اسلام کو نگوں سار۔ جب تک ہم اس خوش فہمی سے نہیں نکلیں گے حقائق سے دوچار نہیں ہو سکیں گے۔

جہاں تک خارجی دنیا کا تعلق ہے، وہاں بھی حقیقی اسلام اور مروجہ اسلام کا فرق کچھ کم نمایاں انداز سے سامنے نہیں آیا۔ بھارت۔ پاکستان کی حالیہ جنگ ہی میں دیکھئے۔ یہاں سے وہاں تک بیسیوں مسلم مملکتیں بکھری پڑی ہیں لیکن ان میں سے کونسی مملکت تھی جس نے میدانِ جنگ میں آکر ہمارا ساتھ دیا۔ میدانِ جنگ میں اترنا تو ایک طرف ان میں سے کسی ایک نے ہندوستان کے ساتھ اپنے سفارتی تعلقات منقطع کرنے تک کی ہمدردی کا ثبوت نہ دیا۔ افغانستان ہمارا قریب ترین مسلم ہمسایہ ہے جب ہندوستان کے بمبار طیارے پاکستان کی شہری آبادی کو اپنا نشانہ بنا کر تباہی مچا رہے تھے تو حکومتِ افغانستان نے حکومتِ ہند سے کہا تھا کہ وہ

پاکستان میں بسنے والی پختون آبادی کے علاقوں پر بمباری نہ کریں۔ (پاکستان ٹائمز ۱۰/۱۲)

افغانستان کے مسلمان بھی مروجہ اسلام کے ہم سے بھی زیادہ پابند ہیں۔ لیکن یہ اسلام ہم میں اور ان میں کسی رشتہ اخوت کا موجب نہیں بن رہا۔ انہوں نے اپنے تعلقات کی بنیاد نسلی یا لسانی رشتہ پر ہی استوار کی ہے اور یہی کیفیت ساری دنیا کے مسلم ممالک کی ہے۔ ہمارے مروجہ اسلام کے مصنوعی ہونے کا تو یہ عالم ہے لیکن اس اسلام کے علمبردار امت کو مسلسل اس فریب میں رکھے چلے جا رہے ہیں کہ یہی حقیقی اسلام ہے اور اسی کے ساتھ متمسک رہنے میں ہماری نجات کا راز پوشیدہ ہے۔ اسی اسلام کی بنا پر ہمیں دنیا کے ہر محاذ پر شکست کھانی پڑتی ہے۔ لیکن ہر شکست پر ہم سے کہا یہ جاتا ہے کہ اس شکست کی وجہ یہ ہے کہ تم نے اسلام کو چھوڑ دیا ہے، اور اسلام سے ان کی مراد یہی مروجہ اسلام ہوتا ہے۔ یاد رکھیئے! جب تک ہم اس فریب سے نہیں نکل جاتے کہ ہمارا مروجہ اسلام وہ اسلام نہیں جسے خدا نے انسانوں کے لئے تجویز کیا تھا اور جسے اس کے آخری رسولؐ نے دنیا تک پہنچایا تھا، ہمیں زندگی کے کسی محاذ پر بھی کامیابی نہیں

ہو سکتی۔ اور وہ اسلام خدا کی کتاب (قرآن مجید) کے اندر محفوظ ہے — وہ قرآن جس کا مصرف مروجہ اسلام کی رُو سے اس سے زیادہ کچھ نہیں رہ گیا کہ

از یٰسین او آساں بمیری

اگر فطرت کی طرف سے حالیہ سخت تعزیر کے بعد ہماری آنکھیں کھل جائیں اور ہم مروجہ اسلام کو حقیقی اسلام سمجھنے کے فریب سے نکل جائیں، تو یہی (یوں سمجھئے کہ) ہم نے کچھ کھو کر بہت کچھ پالیا۔ ایک خطہ زمین کا ہاتھ سے نکل جانا کوئی ایسا مرگ آفریں حادثہ نہیں جس سے ہم ابدی مایوسیوں کا شکار ہو جائیں۔

اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم
مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں!

جب صدرِ اول میں مسلمانوں نے قرآن کو اپنا راہ نما بنایا تھا تو ان کے پاس زمین کا ایک چپہ بھی نہ تھا اور اس کے بعد اس شمع آسمانی کی راہنمائی میں، وہ دیکھتے ہی دیکھتے آدھی دنیا کے مالک بن گئے۔ پچیس سال پہلے خود ہمارے پاس بھی ایک انچ زمین نہیں تھی، قرآن پر مبنی ایک دعویٰ سے ہم اس عظیم مملکت کے مالک بن گئے۔ اگر ہماری کوتاہیوں، غفلتوں اور اجتماعی جرائم کوشیوں کی وجہ سے ہمیں یہ سزا ملی ہے تو ہم ابدی طور پر راندۂ درگاہ تو نہیں ہو گئے! اس وقت بھی ہمارے پاس جو خطہ زمین (مغربی پاکستان) باقی ہے، یورپ کی کتنی مملکتیں ہیں جن سے اس کا رقبہ زیادہ ہے۔ پھر، گزشتہ جنگ عظیم کے بعد (مثلاً) جو حالت جرمنی کی تھی، ہمارا یہ خطہ زمین اس سے تو کہیں بہتر حالت میں ہے۔ وہاں تو کوئی ایک شہر بھی محفوظ نہیں رہا تھا اور برلن کی کوئی عمارت باقی نہیں رہی تھی۔ اس کے باوجود اس قوم نے چند ہی سالوں کے عرصہ میں ایسی محیر العقول ترقی کر لی کہ وہ امریکہ جیسے متمول ملک کو قرضے پیش کرتی تھی۔ جب دوسری قومیں اپنی باز آفرینی کے لئے یہ کچھ کر سکتی ہیں تو ہم ایسا کیوں نہیں کر سکتے! ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اپنی ساری توانائیاں اور صلاحیتیں اس خطہ ارض کے تحفظ، استحکام اور فروغ کے لئے مختص کر دیں۔ اور اس کے بعد

چوں بخت شوی خود را بر سلطنت جم زن

صدرِ مملکت مسٹر بھٹو نے اپنی پہلی نشری تقریر میں کہا ہے کہ ہم نے ایک "نیا پاکستان" تعمیر کرنا ہے اور اس کے ساتھ ہی اس امر کا بھی اعلان کیا ہے کہ

> ہم یہاں سے ایک عظیم تر اور درخشندہ تر پاکستان کی طرف قدم بڑھائیں گے۔ یہ اس لئے کہ ہم اسلام پر ایمان رکھتے ہیں جو خدا کا آخری پیغام ہے۔ وہ اسلام جس نے دنیا کو اخوت، مساوات اور مواخات کا درس دیا۔ اسلام، اس معاشرتی ترقی کے ساتھ جسے ہم اسلامی سوشلزم خیال کرتے ہیں، اور جس کی بنیاد اخوت، مساوات، باہمی سہارا اور تعاون ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ ہم اس مقصد میں ضرور کامیاب ہوں گے۔ مجھے اس پر یقین کامل ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ اسلام وہی ہو سکتا ہے جو خدا کے آخری پیغام (قرآن مجید) کی دفتین میں محفوظ ہے اور جس کے اصول و ضوابط ابدی اور غیر متبدل ہیں۔ یہ وہ اسلام ہے جس میں:

(۱) اقتدارِ اعلیٰ صرف خدا کی کتاب کو حاصل ہوتا ہے۔

(۲) جس میں مذہبی پیشوائیت کا وجود نہیں ہوتا۔ یاد رکھیئے۔ پاکستان کی نکبت و زبوں حالی، تشتت و افتراق، پسماندگی اور بے چارگی کی بیشتر ذمہ دار مذہبی پیشوائیت ہے۔

(۳) جس میں نہ ذرائع پیداوار پر کسی کی ملکیت ہوتی ہے، نہ کسی کے پاس ضرورت سے زاید دولت رہ سکتی ہے۔

(۴) جس میں تمام افراد مملکت کی ضروریاتِ زندگی کا بہم پہنچانا مملکت کی ذمہ داری ہوتا ہے۔

(۵) جس میں ہر فرد و معاشرہ — حتیٰ کہ سربراہِ مملکت تک، اپنے ہر عمل بلکہ ارادہ اور نیت کے لئے خدا کے ہاں جواب دہ ہوتا ہے۔ اسے مکافاتِ عمل یا آخرت پر ایمان کہا جاتا ہے۔

اگر یہاں یہ نظام قائم ہو جائے تو مشرقی پاکستان کی بازیابی اور بھارتی دراز دستیوں کا استیصال تو ایک طرف، دیکھئے کہ آپ، چند دنوں میں کس طرح اقوامِ عالم پر برتری حاصل نہیں کر لیتے۔ ہماری موجودہ تخریب، اس تعمیرِ نو کا پیش خیمہ بن جائے تو ہمارے سارے زخم مندمل ہو جائینگے۔ ایسا بھی تو ہوتا ہے کہ خود موجوں کے تھپیڑے کشتی کو ساحل پر پھینک دیتے ہیں۔ بنا بریں، قرآن کی موجودگی میں ہمارے لئے مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ مایوسی اسوقت طاری ہوتی ہے جب انسان کو کشاد کا کوئی راستہ نظر نہ آئے۔ اور جس قوم کے پاس ایسی درخشاں قندیلِ آسمانی موجود ہو۔ اس پر کبھی ایسا وقت نہیں آنا چاہیئے کہ اسے کشاد کی کوئی راہ دکھائی نہ دے۔

اس وقت حالات لحہ بہ لحہ اس تیزی سے بدل رہے ہیں، کہ کسی معاملہ کے متعلق فرصت سے سوچنے کی گنجائش نہیں۔ اس لئے ہم سردست انہی اصولی مباحث پر اکتفا کرتے اور مختلف مسائل پر تفصیلی گفتگو آئندہ پر اٹھا رکھتے ہیں۔ البتہ آخر میں ہم ایک ایسے نکتہ کا سامنے لانا ضروری سمجھتے ہیں جو ہمارے نزدیک بڑا بنیادی ہے اور وہ یہ کہ اس جنگ میں جو کچھ ہمارے خلاف ہوا ہے اس کی ذمہ داری ہماری افواج کے جیالوں پر قطعاً عاید نہیں ہوتی۔ کیسی گہری سازش کا نتیجہ نظر آتا ہے جسے تحقیق کے بعد عوام کے سامنے آجانا چاہیئے[1] ہماری افواج نے اس جنگ میں بھی جس جرأت و بسالت اور جس جاں فروشی اور جگر داری کا مظاہرہ کیا ہے، قوم کو اس پر بے انتہا فخر ہے۔ قوم کے دل میں ہماری افواجِ قاہرہ کے لئے احترام و تکریم کے جو جذبات پہلے تھے، ان میں اب مزید اضافہ ہو گیا ہے۔ انہیں چند افراد کی غداری کی وجہ سے ہمت نہیں ہارنی چاہیئے۔

> اے ہماری قابلِ صد رشک افواج کے جیالو! اس خطۂ پاک کی حفاظت کا دار و مدار تمہاری ہمت اور حوصلہ پر ہے۔ اگر (خدا نہ کردہ) تم نے حوصلہ ہار دیا تو پھر — ہماری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں۔
> — بھارت کیطرف سے ہمیں ہر وقت چوکس رہنے کی ضرورت ہے اور یہ صرف تمہارے بازوئے شمشیر زن ہیں جو اس کی مکاریوں اور عیاریوں کا منہ توڑ جواب دے سکتے ہیں۔ قوم کو تمہارے ان باطل شکن بازوؤں کی قوت پر پورا پورا بھروسہ ہے۔

ہمارے جواں بخت و جواں ہمت جیوش و عساکر کے لئے ہمارے دل میں جو بے پناہ جذباتِ عقیدت و احترام موجزن ہیں۔ اس کے پیشِ نظر ہم نے حالیہ جنگ کے آغاز میں یہ طے کیا تھا کہ ہم نے ۱۹۶۵ء کے جہاد کے سلسلہ میں جو کچھ

---

[1] ابھی ابھی خبر آئی ہے کہ صدر مملکت نے اس تحقیقات کے لئے ایک کمیشن مقرر کر دیا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ کمیشن حمیت کے مقدمہ کی طرح طویل المیعاد نہیں بن جائے گا۔

لکھا تھا اس کا کچھ حصہ اس دفعہ دہرایا جائے تاکہ ہمارے مجاہدین کی عظمتیں ابھر کر ہمارے سامنے آجائیں۔ اس جنگ میں اگرچہ نقشہ کچھ بدل گیا ہے لیکن ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ اپنے ان نقوش کو علی حالہ زینت دہ قرطاس رکھیں۔ اسلئے وہ مسطور آئندہ صفحات میں قارئین کے سامنے آجائینگی۔

جنگ کے سلسلہ میں ایک اور اصولی بات کا سامنے لایا جانا بھی ضروری ہے۔ ہم نے شروع ہی سے یہ غلطی کی کہ اس خطۂ زمین کے تحفظ ہی کو اپنا منتہیٰ قرار دے لیا۔ یہ غلط تھا۔ ہمیں اپنے سامنے نصب العین یہ رکھنا چاہیئے تھا کہ تقسیم ہند کے وقت اور اس کے بعد، ہمارے ساتھ جس قدر زیادتیاں اور ناانصافیاں ہوئی ہیں، ہمیں ان کا ازالہ کرانا ہے۔ ریڈکلف اوارڈ کی رُو سے ہماری مملکت کی حدود کا تعین سب سے پہلی ناانصافی تھی جو ہمارے ساتھ ہوئی۔ حیدرآباد، جونا گڑھ وغیرہ کے الحاق کے سلسلہ میں جو کچھ ہوا وہ بھی سراسر زیادتی تھی۔ پھر ہندوستان نے جس دھاندلی سے کشمیر کو ہتھیا لیا، اس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ یہ تمام زیادتیاں تھیں جو ہمارے ساتھ ہوئیں۔ ان کا ازالہ ہمارا نصب العین ہونا چاہیئے تھا۔ اگر ایسا آئینی طور پر ممکن ہوتا تو ہو المراد، ورنہ ان کی تلافی بزور شمشیر کرائی جاتی۔ ہمیں اٹھتے بیٹھتے یہ سبق پڑھایا جاتا ہے کہ اسلام کی جنگیں مدافعانہ (DEFENSIVE) ہوتی ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ اسلام کی جنگیں مدافعانہ ہوتی ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ وہ کس بات کی مدافعت کے لئے جنگ کی اجازت دیتا ہے۔ وہ جنگ کی اجازت دیتا ہے حق اور انصاف کی مدافعت کے لئے۔ وہ جنگ کی اجازت دیتا ہے مستقل اقدار انسانیت کی مدافعت کے لئے، خواہ یہ جنگیں کسی ملک اور کسی مقام میں جا کر بھی کیوں نہ لڑنی پڑیں۔ جب حضور نبی اکرم نے ایران کے کسریٰ اور روم کے قیصر کو لکھا تھا کہ تمہارے ملک میں کسانوں پر جو مظالم ہو رہے ہیں انہیں روکو ورنہ ان کا خمیازہ تمہیں بھگتنا پڑے گا، تو وہ مدافعانہ جنگ ہی تھی جس سے انہیں متنبہ کیا گیا تھا۔ قرآن نے جب کہا تھا کہ اپنی سرحدوں کو پوری پوری قوت کے ساتھ مستحکم رکھو تو اس کا مقصد یہ بتایا تھا کہ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ ۔ (۸/۶۰) تاکہ اس سے "تمہارے دشمنوں" اور "اللہ کے دشمنوں" کے دل میں خوف طاری رہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں "تمہارے دشمنوں" سے مراد وہ مخالفین ہیں جو مسلمانوں کی مملکت پر حملہ کرنے کے ارادے کریں، اور "خدا کے دشمنوں" سے مراد وہ قوتیں ہیں جو انسانیت پر ظلم اور زیادتی کریں خواہ وہ دنیا کے کسی حصے میں بھی کیوں نہ ہوں۔ قرآن نے اسلامی جنگوں کو جو "قتال فی سبیل اللہ" کہا ہے (یعنی اللہ کی راہ میں جنگ) تو اللہ کی راہیں کسی ایک خطۂ زمین کے اندر محدود ہو کر نہیں رہ جاتیں۔ وہ سارے کرۂ ارض پر پھیلی ہوئی ہیں، جہاں کوئی "خدا کے راستے" میں روک بنکر کھڑا ہو، اسے راستے سے ہٹانا، اسلامی جیوش و عساکر کا فریضہ قرار پاتا ہے۔ اس مقصد کے لئے جو جنگ بھی لڑی جائیگی وہ اسلام کی مدافعانہ جنگ ہوگی۔ یعنی حق و صداقت کی مدافعت کے لئے جنگ۔ لہٰذا ہمیں اپنے سامنے نصب العین یہ رکھنا چاہیئے تھا کہ ہمارے ساتھ جو بھی زیادتیاں ہوئی ہیں: ہم اوّلاً ان کے ازالہ کے لئے (عند الضرورت) جنگ کرینگے، اور ثانیاً، دنیا کے کسی خطہ میں بھی جہاں حقوقِ انسانیت کی پامالی ہوگی، ان کی حفاظت کے لئے اٹھینگے۔ ہم نے محض اپنے خطۂ زمین کی حفاظت کو اپنا نصب العین قرار دیکر، اپنے حوصلوں کے یم بیکراں کو جوئے کم آب میں سمٹا لیا اور اپنے فضائیر شاہینوں کو پابند قفس کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارا مقصد، اسلام (یعنی حقوقِ انسانیت) کی حفاظت کے بجائے وطن کی حفاظت رہ گیا۔ آپ نے ۶۵ء کی جنگ میں بھی دیکھا ہوگا اور حالیہ جنگ میں

بھی، کہ ہمارا ہر نعرہ اور ہر ترانہ 'اے وطن! پیارے وطن' تک محدود رہا ہے۔ اسلام — یعنی اقدارِ انسانیت — کا نام تک نہیں آیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ وطن کی حفاظت بھی ضروری ہے۔ لیکن وطن مقصود بالذات نہیں۔ وہ تو ایک عظیم مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ اور وہ عظیم مقصد ہے اسلام (اقدارِ خداوندی) کا عملی نفاذ۔ حصولِ مقصد کے لئے ذریعہ کا تحفظ ضروری ہوتا ہے۔ لیکن اگر ذریعہ ہی مقصود بالذات قرار پا جائے تو یہ ایک نیام بے شمشیر یا جسدِ بے روح کی حفاظت کے مرادف ہوگا۔

بہرحال، ہم کہہ یہ رہے تھے کہ اب ہمارے سامنے اولین مقصد اس خطۂ زمین کا استحکام اور فروغ ہونا چاہیئے۔ تاکہ اس کے ذریعے ہم ان تمام زیادتیوں اور بے انصافیوں کا ازالہ کر سکیں جو تقسیمِ ہند کے وقت سے اب تک ہمارے خلاف روا رکھی گئی ہیں اور جن کی آخری کڑی استحصالِ مشرقی پاکستان ہے۔ اسے قوتِ بازو ہی سے حاصل کرنا ہوگا کہ

خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے
مسلماں کو ہے عار وہ پادشاہی

اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنا نظامِ تعلیم بدلیں۔ معاشی نظام بدلیں اور عسکری قوت زیادہ سے زیادہ فراہم کریں۔ اس (آخری) سلسلہ میں ایک اصولی نکتہ بڑا اہم ہے۔ سول اور فوج کے دوائر کار اپنے اپنے ہیں اور جب بھی ایک شعبہ دوسرے کے اندرونی نظم و نسق میں مداخلت کرتا ہے نتیجہ خرابیوں کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔ فوج نے سول کے نظم و نسق میں مداخلت کی تو اس سے پیدا شدہ تباہی ہمارے سامنے ہے۔ اگر سول فوج کے اندرونی نظم و نسق میں دخیل ہوگی تو اس کا نتیجہ اس سے بھی زیادہ تباہ کن ہوگا۔ سول کا کام یہ ہونا چاہیئے کہ وہ اپنی پالیسی، فیصلہ اور مقصد سے فوج کو مطلع کر دے اور اسے پھر فوج کے ذمہ دار ارکان پر چھوڑ دے کہ وہ اس مقصد کے حصول کے لئے کیا طریق کار اختیار کرتے ہیں۔ اس پر کڑی نگاہ رکھے لیکن بیجا مداخلت نہ کرے۔ اور آخر میں یہ کہ سول ہو یا ملٹری، دونوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے آپ کو کتاب اللہ کے تابع رکھیں۔ قرآن کا قانون اور شمشیرِ جگر دار۔

ایں دو قوت حافظِ یک دیگر اند
کائناتِ زندگی را محور اند

(مرقومہ ۲۰ تا ۲۴ دسمبر)

(بقیہ)

طلوعِ اسلام کنونشن

نومبر کے اواخر میں منعقد ہو رہی تھی کہ جنگ کی وجہ سے اُسے ملتوی کرنا پڑا۔ اب اس سلسلہ میں بے شمار استفسارات موصول ہو رہے ہیں کہ کنونشن کب تک منعقد ہوگی۔ ہمیں اس کا احساس ہے کہ کنونشن جلد از جلد منعقد ہونی چاہیئے بالخصوص اس لئے کہ موجودہ نازک ترین حالات میں قرآنی راہ نمائی کے لئے قوم کی نگاہیں بار بار طلوعِ اسلام کی طرف اٹھ رہی ہیں، اور ہمیں ان نگاہوں کو مایوس نہیں لوٹانا چاہیئے۔ لیکن ابھی حالات اعتدال پر نہیں آئے۔ جونہی فضا میں سکون پیدا ہوا، کنونشن کے انعقاد کا فیصلہ کر کے قارئین کو اس سے مطلع کر دیا جائے گا۔

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام

ہمارا ازلی دشمن

اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ

عام طور پر سمجھا یہ جاتا ہے کہ ہندی مسلمانوں نے جب تقسیمِ ہند کا مطالبہ کیا، اور ہندوؤں کی مخالفت کے علی الرغم اپنی الگ مملکت (پاکستان) قائم کر لی تو اس سے ہندوؤں کی طرف سے مخالفت کا آغاز ہوا جو آہستہ آہستہ بڑھتے بڑھتے پہلے جنگ ستمبر ۱۹۶۵ء اور اس کے بعد حالیہ جنگ کی شکل اختیار کر گئی۔ یہ خیال سطح بینی اور تاریخی حقائق سے بے خبری پر مبنی ہے۔ ہندو کی طرف سے مسلمانوں کی مخالفت بلکہ عداوت کا سلسلہ ہزار سال پہلے سے شروع ہوا تھا جو کبھی آتشِ خاموش کی طرح اندر ہی اندر سلگتا رہتا اور کبھی شعلہ جوالہ کی طرح بھڑک کر سطح کے اوپر آجاتا۔ زیرِ نظر سطور میں ہندو کے سلسلۂ عداوت کی مختلف کڑیوں کا اجمالی سا جائزہ لیا جاتا ہے تاکہ یہ حقیقت ابھر کر سامنے آجائے کہ ہمیں کس قسم کے "ہمسایہ" سے واسطہ پڑ رہا ہے!

آج سے ہزاروں سال پہلے کی بات ہے کہ ایران کی طرف سے ایک قوم ہندوستان میں داخل ہوئی جو تاریخ کے اوراق میں آریہ کے نام سے متعارف ہوئی۔ اسے ہندوستان کے قدیم قبائلی باشندوں کے مقابلہ میں زیادہ قوت حاصل تھی اس لئے اس نے ان باشندوں کی اکثریت کو جنگلوں اور پہاڑوں کی طرف دھکیل دیا۔ اور باقیوں کو اپنی پست خدمت کے لئے غلامی کی زنجیروں میں جکڑ لیا۔ انہیں شودر یا اچھوت کہا گیا۔

اکال الامم

اس کے بعد متعدد اقوام، ہندوستان میں حملہ آوروں کی حیثیت سے وارد ہوتی رہیں اور ان میں سے بیشتر نے یہاں اپنی حکومت بھی قائم کر لی۔ لیکن آج آپ کو ان میں سے کسی قوم کا جداگانہ تشخص ہندوستان میں نہیں ملے گا۔ ظاہر ہے کہ ان حملہ آور قوموں کا اپنا قومی تشخص تھا۔ اپنا جداگانہ نسلی امتیاز تھا۔ اپنی زبان تھی۔ اپنی ثقافت تھی۔ اپنا مذہب بھی تھا۔ لیکن یہاں بس جانے کے بعد ان میں ان امتیازات میں سے کوئی بھی باقی نہ رہا ۔۔۔ وہ "ہر چہ در کانِ نمک رفت، نمک شد" ۔۔۔ کے مطابق سب کی سب "ہندو" ہو گئیں۔ بھارت کی کالی ماتا ان سب کو نگل گئی۔ حالی نے اسی جہت سے بھارت کو اکال الامم کہا تھا۔ یعنی مختلف قوموں کو کھا جانے والی۔

ایک سخت جان قوم

لیکن ان باہر سے آنے والوں میں ایک قوم ایسی بھی تھی جسے اکال الامم ہزار حیلوں کے باوجود نگل نہ سکی۔ اس نے اپنا جداگانہ تشخص اور امتیازی وجود باقی رکھا۔ یہ تھی

مسلمانوں کی قوم۔ ہندو نے اسے ہڑپ کرنے کے لئے ہزار جتن کئے۔ حتیٰ کہ ہندو راجاؤں نے مسلمان بادشاہوں کو اپنی بیٹیاں تک دیدیں۔ حالانکہ کسی غیر ہندو سے رشتہ ناطہ کرنا تو ایک طرف، ہندو اپنی ذات برادری سے باہر بھی رشتہ نہیں کرتا۔ ذات تو ایک طرف، وہ گوتوں تک کی تحقیق و تفتیش کے بعد رشتے کرتا ہے۔ لیکن اس نے اپنے مذہبی احکام اور نسلی روایات تک کو بالائے طاق رکھ کر مسلمان بادشاہوں کو اپنی بیٹیاں بھی دیدیں لیکن یہ قوم کچھ ایسی سخت جان تھی کہ ان ہندو رانیوں کے بطن سے پیدا ہونے والے لڑکے بھی مسلمان ہی رہے، ہندو نہ بن سکے۔ ہندو کے لئے اس شکستِ پندار کے زخم ناقابلِ اندمال تھے۔ اس پر طرہ یہ کہ مسلمان یہاں حکمرانوں کی حیثیت سے رہتے تھے اور حکمران بھی ایسے جن کی مملکت کی وسعت قریب قریب سارے ہندوستان کو محیط تھی۔ ہندو کے دل میں اس عداوت نفرت، حسد اور انتقام کی آگ صدیوں تک سلگتی رہی۔ اور جب سلطنت مغلیہ کا زوال شروع ہوا تو اس نے کھل کر سامنے آنے کی تدابیر سوچیں۔ آگے بڑھنے سے پہلے اس حقیقت کی وضاحت ضروری ہے کہ ہندو شاستروں کی تقسیم عمل کی رُو سے سلطنت کی حفاظت کا ذمہ کشتریوں کا ہوتا ہے اور بظاہر حکومت کے سربراہ بھی وہی ہوتے ہیں لیکن زمامِ حکومت درحقیقت برہمنوں کے ہاتھ میں رہتی ہے اور ان کے فیصلوں کے خلاف کوئی راجہ ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتا۔ اس لئے مسلمانوں کی سلطنت کے خلاف جتنی سازشیں ہوئیں، وہ سب کی سب کسی نہ کسی شکل میں برہمنوں ہی کی پیدا کردہ تھیں ——— آج بھی ہندوستان کی حکومت براہمنوں ہی کے ہاتھ میں ہے ——— مغلیہ سلطنت کے انحطاط

سیواجی پر سب سے پہلے، اس کے خلاف مرہٹوں کو ابھارا گیا۔ سیواجی ابھی نوعمر ہی تھا کہ سمرتھ رامداس نامی براہمن نے مسلمانوں کے خلاف اس کے کان بھرنے شروع کر دیئے۔ اس نے (لالہ لاجپت رائے کے الفاظ میں جنہیں انہوں نے اپنی تصنیف "سیواجی کی سوانح حیات" میں قلمبند کیا ہے) "سیواجی کو بار بار اسلام کے خلاف جنگ کرنے کا اپدیش دیا"۔ اس امر کی شہادت اس خط سے بھی ملتی ہے جو سیواجی نے راجہ جے سنگھ کے نام لکھا تھا۔ اس میں اس نے تحریر کیا تھا۔

> میری تلوار مسلمانوں کے خون کی پیاسی ہے۔ افسوس صد ہزار افسوس کہ یہ تلوار مجھے ایک اور ہی مہم کے لئے میان سے نکالنی پڑی۔ اسے مسلمانوں کے سر پر بجلی بن کر گرنا چاہیئے تھا جن کا نہ کوئی مذہب ہے اور نہ ہی انہیں انصاف کرنا آتا ہے۔ . . . . . میری بادلوں کی طرح گرجنے والی فوجیں مسلمانوں پر تلواروں کا وہ مینہ برسائیں گی کہ دکن کے ایک سرے سے لیکر دوسرے سرے تک سارے مسلمان اس سیلابِ خون میں بہ جائیں گے اور ایک مسلمان کا نشان بھی باقی نہ رہیگا۔[1]

سیواجی اپنے مذموم ارادوں میں ناکام رہ کر دنیا سے چل بسا، تو اس برہمن سمرتھ رامداس نے اس کے بیٹے سنبھاجی کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکانا شروع کیا۔ اس نے اس سے کہا کہ

> آپس میں محبت سے رہو لیکن اپنے مسلمان دشمنوں کو ڈھونڈ کر اپنے راستے سے ہٹا دو . . . . لوگوں کے دل میں ان ملیچھوں کا مقابلہ کرنے کا خیال پیدا کرو۔ (تاریخ مہاراشٹر۔ بھائی پرمانند)

---

[1] ویر کیشری شواجی، مصنفہ پنڈت نند کمار شرما۔ اور شواجی مصنفہ لالہ لاجپت رائے۔ (اس مقالہ کی تالیف میں مباشر فضل حسین صاحب کی کتاب "ہندو راج کے منصوبے اور پاکستان کی ضرورت" سے استفادہ کیا گیا ہے۔)

سنبھاجی کے بعد اس کا بیٹا ساہو بر سرِ اقتدار آیا تو اسے ایک اور برہمن ــ باجی راؤ ــ نے مسلمانوں کے خلاف مشتعل کیا۔ اور کہا کہ "ان ملیچھوں کو بھارت ورش کی پوتر بھومی (مقدس سرزمین) سے نکال باہر کرنا ہمارا دھارمک (مذہبی) فریضہ ہے۔" اس کی تقریر کا یہ فقرہ آج تک ہندوؤں کے ہاں دہرایا جاتا ہے کہ

کاٹو۔ درخت کو تنے سے کاٹو تو شاخیں خود بخود گر جائیں گی۔ میری بات کو۔ مانو تو میں اٹک کی دیواروں

پر مرہٹوں کا جھنڈا نصب کر دوں گا۔ (تاریخ مہاراشٹر۔ عباتی برمانند)

لیکن اس منصوبے کو احمد شاہ ابدالی نے خاک میں ملا دیا۔

---(۰)---

بغاوت ہند (۱۸۵۷ء) کے بعد، مغلیہ سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ مسلمان تعرِ مذلّت میں گر گئے۔ لیکن ہندوؤں کے دل میں مسلمانوں کے خلاف نفرت و عداوت کی جو آگ تھی وہ بجھ نہ سکی۔ یہ اس لئے کہ، اس قدر انحطاط اور زوال کے باوجود مسلمان ایک جداگانہ قوم کی حیثیت سے باقی تھے۔ وہ ہندو قوم کا جزو بننے کے لئے آمادہ نہیں تھے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے اب ہندو کے سامنے جنگ کا میدان نہیں تھا، سیاست کی بساط تھی۔ اور اس بساطِ سیاست کے اولین شاطر پھر دو برہمن

تلک اور دیانند

تھے ــ ایک بال گنگا دھر تلک، اور دوسرا سوامی دیانند سرسوتی (آریہ سماج کا بانی) ان کا جامع منصوبہ یہ تھا کہ مسلسل اور وسیع پیمانے پر پراپیگنڈہ کے ذریعے، ہندوؤں کے دل میں مسلمانوں کے خلاف، نفرت اور انتقام کی آگ بھڑکائی جائے، اور اس کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کو منظم کر کے، ایک متحدہ محاذ کی شکل دے دی جائے۔ اس سازش کے جال اس قدر وسیع اور اس کے عزائم اس قدر خطرناک تھے کہ خود حکومت کو انکی تحقیق کرنے کے لئے ایک کمیٹی بٹھانی پڑی جو اس کے صدر (مسٹر جسٹس ایس۔ اے۔ ٹی۔ رولٹ) کی نسبت سے رولٹ کمیٹی کے نام سے متعارف ہوئی۔ اس کمیٹی کی رپورٹ شائع ہوئی تو اس سے عجیب و غریب کوائف کا انکشاف ہوا۔ تلک نے ہندوؤں کے دو میلے منعقد کرنے کی طرح ڈالی تھی۔ یہ تحریک بظاہر بڑی معصوم سی تھی لیکن اس میں کس قدر خطرات پوشیدہ تھے اس کا اندازہ کمیٹی کی رپورٹ سے لگایا جا سکتا ہے جس کا آغاز ان الفاظ سے ہوا تھا۔

گنپتی کا میلہ

مغربی ہندوستان میں معاندانہ تحریک کے آثار ابتدا میں دو سالانہ میلوں میں رونما ہوئے جن میں ایک تو ہندو دیوتا گنپتی کے اعزاز میں منعقد ہوتا ہے اور دوسرا مرہٹہ سردار سیواجی کے اعزاز میں جس نے اہالیانِ دکن کو مسلمان حکمرانوں کے خلاف متحد کیا تھا۔ گنپتی کے میلے کی دھوم دھام سے منانے جانے کی رسم تازہ معلوم ہوتی ہے۔ خیال غالب ہے کہ بمبئی میں ۱۸۹۳ء میں جو فساد ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ہوا تھا۔ اس کے بعد مفسدوں نے ہندو مسلمانوں میں نفاق ڈالنے کا بہترین ذریعہ یہ سوچا کہ گنپتی کا میلہ اعلیٰ پیمانے پر منعقد کیا جائے ..... اس سے مقصود یہ تھا کہ مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو زخمی کیا جائے۔ ... اس خیال کو لیکر ستمبر ۱۸۹۴ء میں مفسدوں نے اس معمولی پوجا کو عالمگیر نمائش بنانے کے انتظامات کے لئے میلے کی ایسی جگہ انتخاب کی جہاں عوام بآسانی جمع ہو سکیں نیز ایسا انتظام کیا گیا کہ جو لوگ گتکا بازی اور دیگر جسمانی ورزشوں کے ماہر ہوں وہ گنپتی کے حضور (اپنے فن کا مظاہرہ کریں) متواتر دس دن تک نوجوانوں کے گروہ

گلیوں اور بازاروں میں ایسے اشعار گاتے پھرے جن سے مسلمانوں اور حکومت کی مخالفت مقصود تھی...
... قدرتاً اس تہوار سے بدامنی اور فسادکی کئی وارداتیں ہوئیں۔ چنانچہ ایک موقعہ پر ساٹھ ستر آدمیوں کے جلوس نے ایک مسجد کے قریب سے گزر کر مسلمانوں کے مذہبی مراسم میں دخل اندازی کی۔

گنپتی کے اس میلے میں اس قسم کے اشلوک گائے جاتے تھے۔

بدطینت لوگ قصابوں کی مانند جلادوں کی سی بے رحمی سے گائیوں اور بچھڑوں کو ذبح کرتے ہیں۔ اٹھو اور گائے ماتا کی مدد کرو۔

دوسری طرف سیواجی کے جنم دن اور تاجپوشی کے دن کی تقاریب پر پونا میں اسی قسم کے میلے منعقد کئے جانے لگے جن میں جی بھر کر مسلمانوں کے خلاف نفرت اور انتقام کے جذبات بھڑکائے جاتے تھے۔ ان میلوں میں اس قسم کے شلوک پڑھے جاتے تھے۔

یاد رکھو! محض سیواجی کی کہانی سنا دینے سے آزادی حاصل نہیں ہو جاتی۔ بلکہ ضروری ہے کہ لوگ سیواجی اور باجی راؤ کی مانند اولوالعزمانہ جانبازی دکھانے کے لئے تیار ہو جائیں۔ اب تم کو ڈھال تلوار سے مسلح ہو جانا چاہیئے کہ ہم نے دشمن کو برباد کرنے کا تصفیہ کر لیا ہے۔ ہم دشمنوں کو مار کر مرینگے۔ تم عورتوں کی طرح بیٹھے کہانیاں سنتے رہو گے۔

اسی میلہ کے ایک اجلاس میں خود تلک صدارت کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنے صدارتی ریمارکس میں کہا۔

سوال یہ ہے کہ کیا سیواجی نے افضل خان کو قتل کر دینے میں کوئی پاپ کیا تھا؟ اس کا جواب مہابھارت کے اوراق میں ملیگا۔ بھگوان کرشن کا صاف ایدیش ہے کہ نشکام کرم ہوتے ہوئے بیشک اپنے گورو اور رشتے داروں کو ہلاک کر دو۔ تم پر کوئی الزام عاید نہیں ہو گا۔ افضل خان کے قتل میں سیواجی کی ذاتی اغراض پوشیدہ نہ تھیں۔ اس نے جو کچھ کیا رفاہِ عام کی خاطر کیا تھا۔ اس کے قتل کو گناہ نہیں کہا جا سکتا۔ اگر ہمارے مکان میں چور داخل ہو جائے اور ہم دیکھیں کہ ان کو نکالنے کے لئے ہم میں کافی قوت نہیں ہے تو چاہیئے کہ انہیں اندر بند کر کے مکان کو آگ لگا دیں اور ان کو زندہ جلا دیں۔

انہی سازشیوں میں ہردیال ایم۔ اے، کا نام بھی سرفہرست دکھائی دیگا۔ اس کے عزائم کیا تھے، ان کا اندازہ اس کے ان الفاظ سے لگ سکتا ہے کہ

ہردیال

جب ہندو قوم میں پورا پورا جوش پیدا ہو جائے گا تو سوراج، شدھی، اور افغانستان کی فتح کے علاوہ ممکن ہے کہ ہم شرقی افریقہ، فجی اور دوسرے ملکوں پر قابض ہو جائیں جہاں ہندو بھائی آباد ہیں۔ کیونکہ اس وقت ہم کسی ہندو بھائی کو غلامی کی حالت میں نہیں چھوڑیں گے۔ بس ہندوستان کو اگر کبھی آزادی ملے گی تو یہاں ہندو راج قائم ہو گا۔ بلکہ مسلمانوں کی شدھی افغانستان کی فتح وغیرہ باقی آدرش (نصب العین) بھی پورے ہو جائینگے۔ (اخبار ملاپ۔ ۱۳ جون ۱۹۲۵ء)

(●)

ایک طرف یہ کچھ ہو رہا تھا اور دوسری طرف، اس سازش کا ایک اور محاذ کھولا جا رہا تھا۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے،

ہندو کا منصوبہ یہ تھا کہ مسلمانوں کے جداگانہ تشخص کو ختم کر کے انہیں ہندوؤں میں مدغم کر لیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے یہ دوسرا محاذ ایک جدید پیرایہ کی تشکیل میں نمودار ہوا جسے انڈین نیشنل کانگرس کا نام دیا گیا۔ یہ سازش "انڈین نیشن" کے دام ہمرنگ زمین کے نیچے چھپی ہوئی تھی۔ اسکے معنی یہ تھے کہ ہندوستان میں بسنے والے تمام افراد (ہندو، مسلمان وغیرہ) سب ایک قوم ہیں۔ بالفاظ دیگر اس کا عملی مفہوم یہ تھا کہ مسلمان ایک جداگانہ قوم نہیں، ہندی قوم کا جزو ہیں۔ آپنے دیکھا کہ یہ سازش کسقدر گہری اور یہ منصوبہ کیسا خطرناک تھا۔ "ہندی قومیت" کا تصور ان لوگوں (ہندوؤں) کیطرف سے پیش کیا جا رہا تھا جن کی زبان میں قوم کے لئے کوئی لفظ ہی نہیں۔ ان کے ہاں "جاتی" کا لفظ ہے جس سے مراد جات (ذات) یعنی (CASTE) ہے۔ جو لوگ ورنوں کی رُو سے، پیدائشی طور پر مختلف خانوں میں بٹے ہوتے ہوں، ان کے ہاں قوم کا تصور کس طرح ہو سکتا ہے۔ لیکن اب انہوں نے "انڈین نیشن" کا تصور وضع کیا جس سے مقصود یہ تھا کہ مسلمانوں کا جداگانہ قومی تشخص باقی نہ رہے۔ یہ تصور ایسا دلکش فریب تھا کہ اچھے اچھے تعلیمیافتہ مسلمان بھی اس کی غایت کو بھانپ نہ سکے اور انڈین نیشنل کانگرس کیطرف لپک کر جانے لگے۔

انڈین نیشنل کانگرس

سرسید

فطرت کی کرم گستری تھی کہ عین اس وقت ان میں سرسید جیسا دیدہ ور پیدا ہو گیا جس نے اس سازش کی گہرائیوں اور پنہائیوں کا صحیح صحیح جائزہ لیا اور پوری جرأت و بسالت سے اعلان کیا کہ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں جو ایک دوسرے میں مدغم نہیں ہو سکتیں، اس لئے "انڈین نیشن" کا تصور ہی باطل ہے۔ سرسید کی یہی پکار تھی جو بانگ درا بن کر اقبال کے حلق سے ابھری اور جسے قائداعظم نے ایک ولولہ انگیز نعرہ کی شکل میں وجہ ارتعاشِ عالم بنایا۔ یہ جملہ معترضہ تھا۔ ہم کہہ یہ رہے تھے کہ ہندو نے اپنے مقصد کے حصول کے لئے دوسرا محاذ قائم کیا۔ ایک طرف مسلمانوں کیخلاف جذباتِ نفرت و انتقام کی بنا پر ہندوؤں کی جداگانہ عسکری تنظیم کا محاذ اور دوسری طرف مسلمانوں کے جداگانہ تشخص کو ختم کرنے کے لئے "انڈین نیشن" کے تصور کا ڈھونگ۔ یاد رہے کہ ہندوؤں کے وہی لیڈر ہندوؤں کی جداگانہ تنظیم (سنگھٹن) کے لئے بھی سرگرم عمل تھے، اور وہی انڈین نیشنل کانگریس کے پلیٹ فارم سے "ہندوستانی قومیت" کے پراپیگنڈہ میں مصروف۔ ہندوؤں کی تنظیم کا دوسرا نام آریہ سماج تھا جسے سوامی دیانند نے قائم کیا تھا۔ اس کے قیام کا مقصد، اس تنظیم کے ایک معروف لیڈر، لالہ دھنپت رائے نے ان الفاظ میں بیان کیا تھا

آریہ سماج

> "ہندوستان میں سوائے ہندو راج کے دوسرا راج ہمیشہ قائم نہیں رہ سکتا۔ ایک دن آئیگا کہ ہندوستان کے سب مسلمان شدھ ہو کر آریہ سماج ہو جائینگے اور اس طرح آخر یہاں ہندو ہی رہ جائینگے۔ یہ ہمارا آدرش (نصب العین) ہے۔ یہی ہماری آشا (آرزو) ہے۔ سوامی جی مہاراج نے آریہ سماج کی بنیاد اسی اصول کو لیکر ڈالی تھی۔" (اخبار پرکاش۔ لاہور۔ ۲۶ اپریل ۱۹۲۵ء)

عوامی سطح پر مسلمانوں کے خلاف جذباتِ نفرت و انتقام کی آگ بھڑکانے کے لئے، سوامی دیانند نے گئو رکھشا (گائے کی حفاظت) کا شاخسانہ کھڑا کیا۔ واضح رہے کہ ویدوں اور شاستروں کی رُو سے، گائے کا گوشت کھانا نہ صرف جائز ہے

گئو رکھشا

بلکہ اسے دیوتاؤں کے استھان پر بطور نذر و نیاز چڑھانے کی بھی تاکید کی گئی ہے۔ لہٰذا، گئو رکھشا کا سوال محض مسلمانوں کے خلاف جذباتِ نفرت مشتعل کرنے کا ایک عوامی حربہ تھا۔ چنانچہ اخبار پرتاپ کے ایڈیٹر، مہاشہ کرشن نے اس باب میں لکھا تھا کہ

گورکھشا کے سوال کا آریہ سماج کے ساتھ بہت سمبندھ (تعلق) ہے کیونکہ اس پر بھارت ورش کا جیون نربھر (زندگی کا دار و مدار) ہے۔ گورکھشا پر سب سے پہلے لیکچر رشی دیانند ہی نے دیئے تھے۔
.... اور وہ چاہتے تھے کہ گاؤکشی کو قانوناً بند کرا دیا جائے۔ (پرتاپ - لاہور - ۱۹ ستمبر ۱۹۲۷ء)

اور اخبار ملاپ نے اپنی ۲۷ اکتوبر ۱۹۲۹ء کی اشاعت میں لکھا تھا کہ

گوہتیارے (گائے پر ظلم کرنے والے) کو سیہ کی گولی سے اڑا دینے کے لئے شاستروں میں آگیا (حکم) ہے۔

آریہ سماجی عام جلسوں میں اس قسم کی اشتعال انگیز تقریریں کیا کرتے تھے۔ مثلاً ۱۹۲۷ء میں سکھر کے ایک جلسہ میں مہاشہ پرتاپ سنگھ نے تقریر کرتے ہوئے کہا۔

گائے ماتا کے گلے پر چھری پھیرنے والوں کے لئے تمہارے دل میں رحم کا کوئی جذبہ نہیں ہونا چاہیئے۔ جہنم کے سپوتو! ارجن کے دلاورو! اگر تم ایک گائے کی خاطر کراچی سے مکہ تک تمام مسلمانوں کو (بھی ختم کر دو) تو بھی تھوڑا ہے۔

مہاتما گاندھی

(مہاتما) گاندھی کو اہمسا (عدم تشدد) کا دیوتا کہا جاتا ہے۔ اس باب میں ذرا ان کا دیا کھیان بھی سن لیجئے۔ انہوں نے ۱۹۱۸ء میں کہا تھا کہ

ہندوستان کے طول و عرض میں ایک ہندو بھی ایسا نہیں جو ایک دن اپنی سرزمین کو گاؤکشی سے آزاد کرانے کی امید نہ رکھتا ہو۔ ہندو مذہب کو جیسا کہ میں جانتا ہوں، عیسائی یا مسلمان کو بزور شمشیر بھی گاؤکشی کو چھوڑنے پر مجبور کرنے سے گریز نہیں کریگا۔

(سٹیٹسمین۔ بحوالہ الفضل - ۹ مارچ ۱۹۱۸ء)

ان اشتعال انگیز بیانات اور تقاریر کا نتیجہ تھا کہ ہندوستان میں جگہ جگہ گاؤکشی کی بنا پر ہندوؤں نے فسادات برپا کئے اور ان کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔

(۰)

مسلمانوں کو ہندو جاتی کے اندر جذب کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ مسلمانوں کو شدھ کر کے ہندو بنا لیا جائے۔

شدھی کی تحریک

واضح رہے کہ کسی غیر ہندو کو ہندو مذہب میں داخل کرنے کا تصور یکسر ہندو مذہب کے خلاف ہے۔ ہندو مذہب تبلیغی ہے ہی نہیں۔ ہندو وہی ہو سکتا ہے جو ہندوؤں کے گھر پیدا ہو جس مذہب میں پیدائشی ذات (ورن) تک نہ بدلی جا سکتی ہو اس میں تبدیلی مذہب سے کسی کو ہندو بنانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ لیکن مسلمانوں کے جداگانہ تشخص کو ختم کرنے کے لئے، شدھی کو بھی جائز قرار دیا گیا اور یہ تصور بھی دیانند ہی کا ایجاد کردہ تھا۔ چنانچہ لالہ لاجپت رائے، سوامی دیانند کی سوانح عمری میں لکھتے ہیں کہ۔

سوامی دیانند پہلا شخص تھا جس نے ہندوؤں کو شدھی کی طرف راغب کیا۔

شدھی سے اصل مقصد کیا تھا، اس کی بابت ایک اور ہندو کی زبان سے سنیئے۔ اخبار پرتاپ (لاہور) کے ایڈیٹر نے ۱۴ جنوری ۱۹۲۷ء کو لکھا تھا۔

ہندو کیا کریں جبکہ دنیا کا نظام ہی تعداد کے سہارے چل رہا ہو۔ اس ملک کی حکومت صرف تعداد کے اصول پر قائم ہے جس کے لئے ہندوستانیوں کا باوا آدم نرالا ہے۔ یہاں کونسلوں میں ادھیکار (اختیارات) بھی تعداد کے لحاظ سے ملتے ہیں۔ جن صوبوں میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہے وہاں عملی طور پر مسلم حکومت ہے۔ ہم پنجاب میں رہتے ہوئے جانتے ہیں کہ مسلم حکومت کیا ہے؟ اس وقت شدھی، ہندوؤں کے لئے زندگی اور موت کا سوال بن رہی ہے مسلمان نفی سے سات کروڑ تک پہنچ چکے ہیں۔ عیسائی چالیس لاکھ ہو چکے ہیں۔ سات کروڑ مسلمانوں کے سامنے تیس کروڑ ہندوؤں کا رہنا مشکل ہو رہا ہے۔ اگر کہیں ان کی تعداد بڑھ گئی تو نہ معلوم کیا ہو گا۔ دھرم کو دھرم کے لئے ہونا چاہیئے لیکن ہندوؤں کو تو دوسری ضروریات نے مجبور کر دیا ہے کہ اپنے بھولے بھٹکے بھائیوں کو گلے لگائیں اور جو ان کے بھائی بننا چاہیں ان کو اپنا بھائی بنائیں۔ ہندو اگر اب بھی نہ جاگے تو ان کا کام ختم ہے۔

واضح رہے کہ یہ وہ زمانہ تھا جب اہل ہند کو سیاسی اصلاحات کی رُو سے کچھ اختیارات مل رہے تھے اور یہاں جمہوری نظام کی داغ بیل ڈالی جا رہی تھی۔ شدھی کی تحریک اسی کی پیش بندی کے لئے اختیار کی گئی تھی۔

دہلی سے شائع ہونے والے اخبار تیج نے ۱۹۲۶ء میں، اپنے کرشن نمبر میں لکھا تھا۔

جن گائیوں کو بھگوان کرشن، شردھا (عقیدت) کے ساتھ جمنا ندی کے پوتر استھان (مقدس مقام) پر چراتے تھے، آج تم ان کی رکھشا کرو اور ان کو گئو ہتیا کاروں کے مظالم سے بچاؤ۔ یہ سب کچھ جب ہی ہو سکتا ہے جب آپ شدھی، سنگھٹن اور دلت اودھار کا اپنے دل میں نشچہ (عہد) کر لیں.... یہی گوپال (گائیوں کے پالنے والے کرشن) کی سچی بھگتی ہو گی۔ اس سے ہمارا راشٹر بنے گا۔ اس سے ہمارے اختلافات مٹیں گے۔ اس سے باجا اور مسجد کا سوال حل ہو گا۔ اس سے ہمیں ہماری سوتنترتا برابیت (آزادی حاصل) ہو گی۔ دنیا میں پھر آریہ دھرم کا جھنڈا بلند ہو گا۔ بھارت، چکرورتی راج، (عالمگیر حکومت) کا سوامی (مالک) بنے گا۔

اچھوتوں کو جذب کرنا

گئو رکشا اور سنگھٹن کی تحریکوں کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ مندرجہ بالا اقتباس میں دلت اودھار کا بھی ذکر آیا ہے۔ یہ بھی جمہوریت کا توڑ تھا۔ دلت اودھار کے معنی ہیں اچھوتوں کی اصلاح۔ ہندو دھرم کی رُو سے اچھوت (یا شودر) وہ چوتھا ورن ہے جس میں جنم لینے والے کسی اونچی ذات کے ہندو کو چھو بھی نہیں سکتے۔ وہ پیدائشی ناپاک ہوتے ہیں اور ساری عمر ناپاک رہتے ہیں (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) یہ ہندوستان کے قدیم اصلی باشندے تھے جنہیں ہندوؤں نے اپنی خدمت کے لئے غلام بنا رکھا تھا۔ یہ کبھی ہندوؤں کا جزو نہیں بن سکتے تھے۔ ان کا جزو بننا تو ایک طرف، منوسمرتی میں لکھا ہے کہ

اگر کوئی شودر کسی دوج کے برابر بیٹھے تو اس کی کمر میں داغ دیکر اسے گاؤں سے نکال دینا چاہیئے۔
یا اس کے چوتڑوں کو تھوڑا سا کاٹ ڈالنا چاہیئے۔

اچھوت تو ایک طرف، پنڈت مدن موہن مالویہ جیسا تعلیم یافتہ، بین الاقوامی شہرت کا لیڈر، بڑے فخر سے

کہا کرتا تھا کہ

> میں جب کسی انگریز سے ملتا ہوں تو ملنے کے بعد پانی سے ہاتھ دھو لیتا ہوں۔

اچھوتوں کو ہندو قرار دینے سے مقصد کیا تھا؟ اس کے متعلق اخبار ملاپ نے اپنی ۲۲ جنوری ۱۹۲۷ء کی اشاعت میں لکھا تھا کہ

> ہندوؤں کے لئے اچھوت ادھار کا مسئلہ زندگی اور موت کا سوال ہے۔ مردم شماری میں ہندوؤں کی تعداد کم ہو رہی ہے۔ جبکہ مسلمان اور دیگر اقوام ترقی کر رہی ہیں۔ ایک ہندو کا فرض ہونا چاہیئے کہ وہ اپنے وقت اور دھن کا کچھ حصہ اچھوت ادھار کے لئے صرف کرے۔

اسی اخبار میں مسٹر کیلکر جیسے ہندو لیڈر نے لکھا تھا کہ

> خود غرضی کے خیال سے بھی ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم اچھوت ادھار کے کام کو ہاتھ میں لیکر اچھوتوں کو جلد از جلد اپنے اندر ملا لیں کیونکہ موجودہ حکومت میں تعداد ہی ایسی چیز ہے جس پر حکومت میں ممبری کا دارومدار ہے۔

اچھوتوں میں تبلیغ کا کام مسلمانوں نے بھی شروع کیا تھا۔ ہندو اسے کس نگاہ سے دیکھتے تھے، اس کے متعلق اور تو اور خود (مہاتما) گاندھی کی زبان سے سنیئے جب انہوں نے سنا کہ مسلمانوں نے کچھ اچھوتوں کو مسلمان بنا لیا ہے تو

> انہیں یہ سنکر بہت دکھ ہوا اور کہنے لگے کہ مجھے تو اس کا پتہ تک نہیں۔ آپ کی غلطی ہے جو اب تک خاموش رہے۔ یہ بہت برا ہوا۔ کم از کم مجھے اس کی اطلاع ملنی چاہیئے تھی۔ اچھوت ادھار کا کام صرف ہندوؤں کا ہے۔ (پرتاپ ۲۴/۱۲/۲۰)

ہندو سنگھٹن

ایک طرف اچھوتوں کو ہندو قرار دیکر جمہوری طریق سے ہندو راج کے منصوبوں کو تقویت پہنچائی جا رہی تھی اور دوسری طرف ہندو تنظیم (سنگھٹن) کو مستحکم کر کے بزور شمشیر ہندوؤں کی حکومت قائم کرنے کی کوششیں جاری تھیں۔ چنانچہ تحریک سنگھٹن کے مشہور راہنما، ہردیال نے واضح الفاظ میں کہا تھا کہ

> ہندو سنگھٹن کا مقصد یہ ہے کہ بھارت ورش میں ایک ایسی مضبوط، زبردست، متحد اور بیدار سیاسی جماعت قائم کی جائے جو ایک آزاد ہندو ریاست کے آدرش (نصب العین) تک پہنچنے کی کوشش کرتی رہے۔ گورو گوبند سنگھ جی نے اپنے زمانے کی ضرورت کے مطابق ایک ایسا دل بنایا تھا۔ آجکل بھی سوراج پارٹی، انڈی پنڈنٹ پارٹی، لبرل پارٹی وغیرہ سیاسی جماعتیں قائم کی جا رہی ہیں۔ ہندو سنگھٹن کا مقصد یہ ہے کہ ایسا ہندو قومی دل قائم کیا جائے جو ایک آزاد قومی ریاست کی بنیاد ڈالے۔ جب انگلستان کچھ عرصہ بعد ہوم رول یعنی (۵۰٪) نیم سوراجیہ ہمیں پیش کرے تو وہ ہندو قومی دل کے ساتھ عہد و پیمان کرے۔
>
> ہندو سنگھٹن کا آدرش (نصب العین) یہ ہے کہ ہندو قومی سنستھاؤں (انسٹی ٹیوشنز) کی بنیاد پر ہندو قومی ریاست قائم کی جائے۔ ہندو قومی سنستھائیں یہ ہیں۔ مثلاً سنسکرت بھاشا، ہندو قوم کا اتہاس (تاریخ)۔ ہندو تہوار، ہندی مہاپرشوں کا سمرن (ہندو سورماؤں کا تذکرہ) ہندوؤں کے دیش یعنی بھارت یا ہندوؤں کے ستھان (ملک) کا پریم۔ ہندو قوم کی ساہتیہ (تحفظ) کا پریم

وغیرہ وغیرہ۔ جو لوگ آجکل نیم عربی، نیم ایرانی مسلمانوں کو قومی تحریک میں خواہ مخواہ شامل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اس صداقت کو نہیں سمجھتے کہ ہر ایک قومی ریاست پرانی سنستھاؤں پر قائم کی جاتی ہے جن سے لوگوں میں یگانگت کا بھاؤ (رجحان) پیدا ہوتا ہے۔ آجکل کے ہندی مسلمان تو محض جملہ معترضہ ہیں۔ ان کا یہی مستقبل ہے کہ آہستہ آہستہ شدھی کے ذریعے دوبارہ ہندو قوم کے اندر شامل ہو جائیں۔ راج نیتی شاستر (ضابطہ سیاست) کے مطابق مجھے کوئی اور راستہ نظر نہیں آتا۔ (ملاپ ۲۵ ۵/۲)

اسی زمانے میں ہندو سنگٹھن کے ایک اور لیڈر سوامی ستیہ دیو پری پراچک نے اپنی ایک تقریر میں کہا کہ جب ہندو سنگٹھن کے ذریعے طاقتور ہو کر سوراج حاصل کر لینگے تو ہم مسلمانوں کے سامنے حسب ذیل شرائط پیش کرینگے۔

شرائط

(۱) قرآن کو الہامی کتاب نہیں سمجھنا چاہیئے۔ (۲) حضرت محمدؐ کو رسولِ خدا نہ کہا جائے (معاذ اللہ صد بار معاذ اللہ)۔ (۳) عرب وغیرہ کا خیال دل سے دور کر دیں۔ (۴) سعدی اور رومی کے بجائے کبیر، تلسی داس کی تصانیف کا مطالعہ کیا جائے۔ (۵) اسلامی تیوہاروں کے بجائے ہندو تیوہار و تعطیلات منائی جائیں۔ (۶) مسلمانوں کو رام، کرشن وغیرہ دیوتاؤں کے تیوہار منانے چاہئیں۔ (۷) انہیں اسلامی نام بھی چھوڑ دینے چاہئیں۔ (۸) اپنی عبادتیں عربی کے بجائے ہندی زبان میں ادا کی جائیں۔

یہ تھیں وہ شرائط جن کے تسلیم کرنے کے بعد مسلمانوں کو اس کی اجازت دی جا سکتی تھی کہ وہ آزاد ہندوستان میں زندگی کے دن پورے کر سکیں۔ لیکن انہیں اتنی رعایت بھی ابتدائی مرحلہ میں دی جانی مقصود تھی۔ آزاد ہندوستان کے آخری مرحلہ میں لالہ ہردیال کی تجویز کے مطابق اسلام کو بالکل ختم کر دینا مطلوب تھا۔ چنانچہ اس نے کہا تھا کہ:-

اسلام کو ختم کر دیا جائے

جب تک پنجاب اور ہندوستان بدیشی مذہبوں سے پاک نہیں ہو گا تب تک ہمیں چین سے سونا نہیں ملیگا۔ ... جو ہندو اس آدرش کو نہیں مانتا۔ وہ کپوت (ناخلف) ہے، بے جان ہے، مردہ دل ہے، بے سمجھ ہے۔ ہر سچے ہندو کی خواہش یہ ہونی چاہیئے کہ اپنے دیش کو اسلام اور عیسائیت سے پاک کر دے۔ ... پنجاب اور ہندوستان میں دو قومیں مل کر نہیں رہ سکیں گی۔ یا سب ہندو اسلام قبول کر لو۔ یا سب مسلمانوں کو شدھی کے ذریعے ہندو بنا لو۔ یہی اس سوال کا حل ہے۔ ... اتفاق اور امن کے لئے ضروری ہے کہ یا صرف اسلام ہو یا اسلام بالکل نہ ہو۔ بیس فیصد اسلام سے صرف بلوے ہونگے۔ بیس فیصد اسلام کے روڑے کو کوئی ملک ہضم نہیں کر سکتا۔ جس ملک نے اس پتھر کو نگل لیا اس کے پیٹ میں ہمیشہ درد رہیگا۔ ہندوستان میں بیس فیصد اسلام اور پنجاب میں پچاس فیصد اسلام صرف نفاق اور بدامنی کا سرچشمہ ہے۔

(تیج - دہلی - ۲۶ ۳/۴)

اور پروفیسر رام دیو نے اس پر اضافہ کرتے ہوئے فرمایا۔

ہندوستان کی ہر ایک مسجد پر ویدک دھرم یا آریہ سماج کا جھنڈا بلند کیا جائے گا۔

(گرو گھنٹال - ۱۰ ۲/۷)

~~~~ (٭) ~~~~
~~~~

یہ تھے ہندوؤں کے وہ ملعون عزائم جنہیں تشکیل پاکستان نے خاک میں ملا دیا۔ اب آپ خود ہی سوچئے کہ کیا ہندو پاکستان کے وجود کو ایک ثانیہ کے لئے بھی گوارا کر سکتا ہے؟ ان تصریحات سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ:

(۱) ہندوؤں کی طرف سے مطالبہ پاکستان کی اس قدر شدید مخالفت کیوں ہوتی تھی۔

(۲) تقسیم ہند کے ساتھ ہی ہندو لیڈروں نے اس قسم کے اعلانات کیوں کئے تھے کہ یہ تقسیم ایک عارضی عمل ہے۔ کچھ دنوں بعد پاکستان پھر ہندوستان کا جزو بن جائے گا۔

(۳) ریڈکلف اوارڈ کو کس طرح اس سازش کی کامیابی کا اولین ذریعہ بنایا گیا اور تقسیم ہند کے وقت مسلمان مہاجرین کی بے پناہ قتل و غارت گری سے کس طرح اس کی پہلی اینٹ رکھی گئی۔

(۴) تقسیم ہند کے فوری بعد (دسمبر ۱۹۴۷ء میں) انہوں نے پاکستان پر حملہ کرنے کے منصوبے کیوں بنائے تھے۔

(۵) مشرقی پاکستان میں قریب ایک کروڑ ہندوؤں کے بسے رہنے کی سازش سے کیا مقصود تھا۔ اور وہاں مغربی پاکستان کے خلاف مسلسل پراپیگنڈہ کی غایت کیا تھی۔ (واضح رہے کہ سرسید کی تعلیم اور اقبال کے پیام کی آماجگاہ (یعنی اولیٰ) مغربی پاکستان کی سرزمین ہی (اور ہے) اور اسی کی طرف سے ہندو اپنے مقاصد کی بربادی کے خلاف خطرہ محسوس کرتا ہے)۔

(۶) حیدرآباد، جونا گڑھ، منادر پر پولیس ایکشن اور کشمیر پر غاصبانہ قبضہ سے مقصود کیا تھا۔

ان کوائف سے واضح ہو جائے گا کہ ہندوستان کیطرف سے پاکستان پر جو بار بار حملے کئے جا رہے ہیں تو ان کی غایت کیا ہے۔ وہ ان کے لئے عارضی اور ہنگامی اسباب کو محض بہانہ بنا لینا ہے ورنہ اس کا دلی مقصد کسی نہ کسی طرح پاکستان کو پھر سے ہندوستان کا جزو بنانا اور مسلمانوں کو ہندو قومیت میں جذب کر لینا ہے۔ یاد رہے کہ ہندو ہندوستان میں بسنے والے مسلمانوں کا جداگانہ ملی تشخص قریب قریب ختم کر چکا ہے اور اگر یہ سلسلہ اسی رفتار سے جاری رہا تو ایک دو نسلوں کے بعد ان کا وجود تک بھی باقی نہیں رہے گا۔ اگر ہم وہاں رہتے تو اس وقت تک ہمارا بھی یہی حشر ہو چکا ہوتا۔

جو شخص انڈیا۔ پاکستان کے مسئلہ کا اس پس منظر کی روشنی میں جائزہ لیگا وہی ان کی باہمی آویزش کا صحیح اور مؤثر حل تلاش کر سکیگا۔ یہ حل آئے دن کی جنگوں کے بعد (AS - YOU - WERE) کے معاہدوں کی رو سے نہیں مل سکیگا۔ معاہدات کی رُو سے مسائل کا تصفیہ ان اقوام سے ہو سکتا ہے جو کسی اصول کی پابند ہوں۔ ہندوؤں کا شعارِ سیاست کیا ہے اس کا اندازہ کوٹلیہ کے ارتھ شاستر سے لگ سکتا ہے۔ واضح رہے کہ ہندوؤں کی ساری تاریخ میں صرف ایک سیاسی قلاسفر کا نشان ملتا ہے۔ اس کا نام چانکیہ اور لقب کوٹلیہ تھا۔ سنسکرت زبان میں کوٹلیہ مکار کو کہتے ہیں اور چانکیہ بڑے فخر سے اپنے آپ کو کوٹلیہ کہلواتا تھا۔ یہ لقب اس کے نام کے ساتھ آج تک چلا آتا ہے۔ اس نے اصولِ سیاست کے متعلق ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام "ارتھ شاستر" ہے۔ اس میں سیاست اور حکمرانی کے بنیادی اصول حسب ذیل ہیں۔

(۱) حصولِ اقتدار اور ملک گیری کی ہوس کبھی ٹھنڈی نہ ہونے پائے۔

(۲) ہمسایہ سلطنتوں سے وہی سلوک روا رکھا جائے جو دشمنوں سے روا رکھا جاتا ہے۔ تمام ہمسایوں پر اپنی نگرانی قائم رکھی جائے۔

(۳) غیر ہمسایہ سلطنتوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات استوار رکھے جائیں۔

(۴) جن سے دوستی رکھی جائے ان سے دوستی میں ہمیشہ اپنی غرض پیش نظر رہے اور مکارانہ سیاست کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے۔

(۵) دل میں رقابت کی آگ ہر وقت مشتعل رکھی جائے۔ ہر بہانے سے جنگ جاری رکھی جائے اور اس میں انتہائی تشدد سے کام لیا جائے، حتیٰ کہ خود اپنے شہریوں کے مصائب و آلام کی بھی کوئی پرواہ نہ کی جائے۔

(۶) مخالفانہ پراپیگنڈہ، تخریبی کارروائیاں، ذہنی انتشار پیدا کرنے کی مہم دوسرے ملکوں میں اپنے آدمی ناجائز طریق سے داخل کر کے ففتھ کالم کیطرح، یہ سب کچھ مسلسل کیا جائے۔

(۷) رشوت اور دیگر ذرائع سے دوسروں کے خلاف اقتصادی جنگ جاری رکھی جائے۔ دوسرے ملکوں کے آدمیوں کو خریدنے کی کوشش کی جائے۔

(۸) امن کے قیام کا خیال کبھی دل میں نہ لایا جائے خواہ ساری دنیا تمہیں اس پر مجبور کیوں نہ کرے۔

یہ ہے ارتھ شاستر، ہندوؤں کے ہاں کا مقدس صحیفۂ سیاست جو ان کا ایک فلاسفر انہیں دے گیا اور جاتے ہوئے کہہ گیا کہ اگر انسانیت کی بدقسمتی سے، کبھی حکومت تمہارے ہاتھ آجائے تو ان اصولوں پر عمل کرنا۔ فرمایئے کہ ان اصولوں کی وارث اور حامل قوم کے ساتھ معاملات باہمی عہد و پیمان سے بھی حل ہو سکتے ہیں؟

اس کا حل، ایک فیصلہ کن جنگ کے سوا کچھ نہیں — لیکن اس کے لئے تو پہلے خود اپنی ذات سے جنگ کرنی پڑیگی۔ —ایک فیصلہ کن جنگ!!

کہ یہی ہے امتوں کے مرض کہن کا چارہ

(نوشتہ نومبر [illegible])

(پرویز)

عید کا پیغام

ہم پر جو قیامت گزری ہے اس میں تباہیاں مختلف شکلوں میں آئی ہیں۔ ان میں ایک زہرہ گداز شکل یہ ہے کہ دشمن کی بمباری سے بے شمار سرحدی آبادیاں اجڑ گئی ہیں اور متعدد شہروں کی بستیاں تباہ ہو گئی ہیں۔ اس سے ہزاروں گھرانے خانماں خراب ہو گئے ہیں۔ ان کے کمانے والے افراد یا شہید ہو گئے ہیں یا زخمی۔ ان کے بچے یتیم ہو گئے ہیں، ان کی سہاگنیں بیوہ ہو گئی ہیں، جوان بچیاں لاوارث رہ گئی ہیں۔ زخمیوں کے پاس علاج کے لئے کچھ نہیں بچوں کو فاقے آرہے ہیں۔ اس سردی کے موسم میں نہ ان کے پاس پہننے کو کپڑے ہیں نہ اوڑھنے کو لحاف حتیٰ کہ سر پر چھت کا سایہ بھی نہیں۔ جو خوش قسمت لوگ ان حادثات سے محفوظ رہے ہیں ان کا فریضہ ہے کہ ان مظلوموں اور محتاجوں کی ہر قسم کی امداد کریں۔ اس کا ایک طریق یہ ہے کہ اب عید الاضحیٰ آرہی ہے۔ جو ذی استطاعت حضرات قربانی دینے کا ارادہ رکھتے ہیں، ہم ان سے درخواست کریں گے کہ وہ اپنی قربانی کی رقم ان مصیبت زدوں کے لئے نقد ادا کر دیں۔ موجودہ حالات میں یہ بہت بڑا ثواب کا کام ہے۔

اس کے باوجود جو لوگ ضرور قربانی دینا چاہیں ہم ان سے درخواست کریں گے کہ وہ کم از کم قربانی کی کھالیں ہی اس مقصد کے لئے دیدیں — لیکن یہ کچھ انفرادی طور پر نہ کیا جائے۔ ہم حکومت سے درخواست کریں گے کہ وہ ہر شہر میں

قربانی کی نقد رقوم — اور قربانی کی کھالیں

جمع کرنے کا انتظام کرے۔ اور اس طرح حاصل شدہ فنڈ سے برباد شدہ گھرانوں کی ضروری امداد کرے۔ شکریہ۔

وہی مرحبی، وہی عنتری!

(۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کی صبح، ہندوستان نے پاکستان پر، بلا اعلان سابقہ، بھرپور حملہ کر دیا۔ اس سلسلہ میں طلوع اسلام کی اکتوبر ۱۹۶۵ء کی اشاعت میں جو لمعات شائع ہوئے تھے، ان کا اطلاق، موجودہ جنگ کے واقعات پر بھی اُسی طرح ہوتا ہے، اس لئے ہم انہیں، تجدید یادداشت کے لئے، اشاعت حاضرہ میں نذر قارئین کرتے ہیں)

بے معرکہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں

ہندو کے دماغی خلل کا علاج یہ ہے کہ اس کے دل سے یہ زعم باطل نکال دیا جائے کہ مسلمان کمزور ہے۔ اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ مسلمان ہی کا عزم کرے کہ جو آنکھ اس کی طرف بری نیت سے دیکھے گی وہ آنکھ نکال لی جائے گی خواہ وہ کسی سر میں کیوں نہ ہو۔ اگر ہندوؤں نے کسی سمت سے بھی اپنے قدم بڑھائے تو مسلمانوں کی طرف سے اس کا جواب وہی ہونا چاہیئے جو ابدالی کی تلوار نے پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کو دیا تھا۔ یاد رکھئے! اگر ہندو کو ایک بار شکست مل گئی تو پھر وہ خود بھی ان سے رہے گا اور دنیا کا امن بھی بحال ہو جائے گا۔ اور اس کے بعد ہندوستان کے چار کروڑ مسلمان بھی عزت و آبرو کی زندگی بسر کریں گے۔

(طلوع اسلام۔ بابت جولائی ۱۹۴۸ء)

افراد ہوں یا اقوام، ان میں باہمی اختلافات اور تنازعات نمودار ہوتے رہتے ہیں۔ شریف انسانوں کا کام یہ ہے کہ جب کوئی متنازعہ فیہ معاملہ، قاعدے اور قانون کے مطابق، طے ہو جائے تو اسے تسلیم کر لیا جائے، خواہ وہ فیصلہ اپنے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن کم ظرف انسانوں میں اتنی وسعت قلب اور کشادگیٔ نگاہ نہیں ہوتی۔ وہ بظاہر اس فیصلے پر رضامند ہو جاتے ہیں لیکن اپنے دل میں اس کے خلاف گرہ بٹھائے رکھتے ہیں۔ وہ اسے اپنے پندار کی شکست سمجھتے ہیں اور اس کا بدلہ لینے کے لئے، اپنے اندر، بغض و نفرت اور حسد اور انتقام کی آگ سلگائے رکھتے ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ وہ اس کے بعد نہ خود ہی امن اور چین سے بیٹھتے ہیں، اور نہ ہی فریق مقابل کو اطمینان سے بیٹھنے دیتے ہیں۔ اور اگر کبھی خدانخواستہ ایسے فرد یا قوم کے دماغ میں یہ خناس سما جائے کہ فریق مقابل کمزور ہے، تو پھر ان کے اوچھے پن کی کوئی حد نہایت ہی نہیں ہوتی۔ وہ ان حربوں پر اتر آتے ہیں جنہیں قرآن کریم نے "اسفل السافلین" سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی سفاہت و دنائت کی پست ترین سطح۔

تقسیمِ ہند کا مسئلہ، ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابہ النزاع تھا۔ ہندوؤں کی طرف سے اس کی مخالفت ہوئی اور سخت مخالفت۔ برسوں کی آویزش و منافست کے بعد، یہ مسئلہ باہمی رضامندی سے طے پا گیا۔ ملک تقسیم ہو گیا اور ہر ایک نے اطمینان کا سانس لیا۔ جب معاملہ کا تصفیہ ہو گیا تو پھر جھگڑے اور تنازع کا سوال کیا؟ لیکن ہندو کی کم ظرفی نے اسے اپنی شکست پندار پر محمول کیا' اور تقسیمِ ہند کو دل سے قطعاً نہ اپنایا۔ حقیقت یہ ہے کہ حکومت کے لئے جس قسم کی بلند نگہی اور وسعتِ قلبی کی ضرورت ہوتی ہے، ہندو کو وہ نصیب ہی نہیں۔ گذشتہ ہزار سال کی تاریخ میں اسے ہر مقام پر جو شکستیں برداشت کرنی اور ذلتیں اٹھانی پڑی ہیں' اس سے' اس قوم کے تحت الشعور میں عجیب انداز کی نفسیاتی پیچیدگیاں PSYCHOLOGICAL COMPLEXES) پیدا ہو گئے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جونہی کوئی فیصلہ ان کی منشاء کے خلاف ہوتا ہے' وہ اسے اپنی ذلت پر محمول کر لیتے ہیں ـــ اور اگر بدقسمتی سے' ان کا فریقِ مقابل مسلمان ہو تو پھر ان کی جھنجلاہٹ کی کوئی حد ہی نہیں رہتی۔ محمد بن قاسم - محمود غزنوی - بابر - ابدالی وغیرہ کے تصوراتی بھوت ان کے اعصاب پر از سرِ نو سوار ہو جاتے ہیں۔ اور ان کے ہاتھوں کے لگائے ہوئے چرکے' پھر سے تازہ زخم بن جاتے ہیں اور وہ ان تمام شکستوں اور ذلتوں کا انتقام اس حریفِ تازہ سے لینا چاہتے ہیں۔

ہندو' صدیوں سے اس نفسیاتی مرض' ذہنی کوفت اور قلبی سوزش میں مبتلا ہے۔ وہ جب تک محکوم رہا' مسلمانوں کے خلاف اپنے پوشیدہ جذبات حسد و منافرت کا مظاہرہ، چھوت کے رنگ میں کرتا رہا ـــ مسلمانوں سے چھوت کے پیچھے جذبہ ہی یہ کارفرما تھا کہ وہ انہیں قابلِ نفرت سمجھتا تھا اور اس احساس سے اپنی آتشِ انتقام کی تسکین کا سامان پاتا تھا۔ لیکن پاکستانی مسلمانوں ہی کی نہیں' دنیا کی ہر امن پسند قوم کی بدقسمتی کہ اس ذہنیت کی حامل' نفسیاتی مریض قوم کو بیٹھے بٹھلائے اتنے بڑے وسیع ملک کی حکومت مل گئی۔ حکومت ملنے کے ساتھ ہی اس نے دہلی۔ گوالیار۔ مشرقی پنجاب اور ملک کے دوسرے حصوں کے نہتے اور کمزور مسلمانوں پر جو قیامت خیز مظالم ڈھائے۔ پھر، جونا گڑھ۔ حیدر آباد اور کشمیر کے معاملہ میں جو کچھ کیا' وہ ان کے اسی نفسیاتی جنون کے مظاہرے تھے۔ آزادی ملنے کے ایک سال کے اندر اندر' اس نے وحشت و بربریت کے وہ عالم سوز مظاہرے کئے کہ ہم جولائی ۱۹۴۸ء میں' وہ کچھ لکھنے پر مجبور ہو گئے جس کا اقتباس سرِ عنوان دیا گیا ہے۔ وہ دن اور آج کا دن' اس نے اہلِ پاکستان کو ایک رات بھی تو چین کی نیند نہیں سونے دیا۔ عیاری۔ مکاری۔ فریب دہی۔ وعدہ فراموشی۔ عہد شکنی کی آتشِ خاموش سے لے کر قزاقی۔ سفاکی۔ خوں ریزی۔ غارت گری کی شعلہ افگنی تک' کونسا حربہ تھا جو اس نے مسلمانوں کے خلاف استعمال نہیں کیا۔ دنیا دور سے' زیادہ سے زیادہ' ان شعلوں کے دھوئیں ہی کو دیکھ سکتی ہے۔ اسے اس کا صحیح احساس ہو نہیں سکتا کہ ہمیں واسطہ کس قوم سے پڑا ہے!

فغانِ من دلِ خلق آب کرد ہنوز!
نگفتہ ام کہ مرا کار با خسِلاں افتاد

اٹھارہ برس تک ہم اسے برداشت کرتے رہے۔ ہمارا مقدمہ اس "عدالت" (یو - این) میں تھا جس کے متعلق "مہذب اقوام" ہمیں دلاسا دلاتی رہیں کہ وہاں سے انصاف مل جانے کی توقع ہے۔ ہم اس فریب میں رہے ـــ یا یوں کہئے کہ خود ہمارے اربابِ اقتدار میں اس کی ہمت اور حوصلہ نہ تھا کہ وہ فریب کے پردے کو چاک کر کے' حقائق کا سامنا کرتے (اسباب اس کے کچھ بھی تھے)' نتیجہ بہرحال یہ تھا کہ ہندو سر پہ چڑھتا چلا گیا .... ادھر سے آئین و ضوابط اور عہد و معاہدات کی

پابندی ہوتی رہی، اور ادھر سے اندر ہی اندر جنگی تیاریوں پر زور دیا جاتا رہا، تا آنکہ انہوں نے پیش قدمی کر کے، پاکستانی چوکیوں پر قبضہ کر لیا۔ یہ درحقیقت، مقیاس (FEELER) تھا یہ دیکھنے کے لئے کہ جنگ کے تصور کے خلاف پاکستان کا ردعمل کیا ہوتا ہے!

اب وہ مقام آ گیا جو قوموں کی تاریخ میں موت اور زندگی کا فیصلہ کن مرحلہ ہوتا ہے۔ ہندوستان، اپنے رقبہ، آبادی، اور وسائل کے اعتبار سے پاکستان کے مقابلہ میں کتنے گنا بڑا۔ اس کی فوج (سٹرٹیجک مارکے تخمینہ کے مطابق) پاکستان کی فوج سے پانچ گنا زیادہ۔ اس کا سامانِ حرب و ضرب، جو اس نے چین کے ہوا کی آڑ میں، مختلف گوشوں سے ہتھیا رکھا ہے، بے حد و شمار۔ دنیا کی عظیم طاقتیں اس کی پشت پناہ۔ یہ تمام حالات ایسے تھے جو ایک عام سطح کے انسان کو تھرتھرا دینے اور ہندوستان کے سامنے جھکا دینے کے لئے کافی تھے: دو اور دو چار" کی منطق کا تقاضا یہی تھا کہ ہندوستان کے اس چیلنج کو قبول نہ کیا جائے۔ لیکن غیرت اور حمیت کا تقاضا کچھ اور تھا۔ یہ تقاضا پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ:

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی ہے کبھی جاں، اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی
تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی

یہ وہ مقام تھا جس کے لئے قرآن نے کہا تھا کہ خَلَقَ الْمَوْتَ وَ الْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (۶۷/۲)۔ خدا نے موت اور حیٰوۃ کو پیدا ہی اس لئے کیا ہے کہ وہ تمہارے لئے اس بات کا موقع بہم پہنچائے کہ تم اپنی مضمر قوتوں اور زندہ رہنے کی صلاحیتوں کو آزما سکو، اور اس حقیقت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکو۔

خودی ہے زندہ تو ہے موت اک مقامِ حیات
کہ عشق موت سے کرتا ہے امتحانِ ثبات

یہ وہ مقام تھا جس کے لئے اعلان کیا گیا تھا کہ لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّ يَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ (۸/۴۲) جسے زندہ رہنا ہے وہ بھی دلیل و برہان کی رو سے زندہ رہے اور جسے ہلاک ہونا ہے وہ بھی دلیل و برہان کی رو سے ہلاک ہو۔ قرآن کریم کی رو سے زندگی محض نفس شماری کا نام نہیں، نہ ہی موت سے مراد سانس کی آمد و رفت کا بند ہو جانا ہے۔ اس کے نزدیک، مرگِ باشرف کا نام اصل حیات ہے، اور حیاتِ بے شرف، موت۔ وہ، عزت کی موت مرنے والوں کے متعلق کہتا ہے کہ انہیں مردہ مت سمجھو، وہ زندہ ہیں۔ (۲/۱۵۴)۔ وہ ذلت کی زندگی جینے والوں کے بارے میں کہتا ہے کہ وَ يَاْتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّ مَا هُوَ بِمَيِّتٍ (۱۴/۱۷)۔ وہ ایسی زندگی جیتے ہیں کہ جس میں، ہر آن، موت، اپنے خونی پنجے نکالے، چاروں طرف سے یلغار دکھائی دیتی ہے۔ لیکن یہ عذاب ایسا ہوتا ہے کہ وہ مرتے بھی نہیں کہ اسی طرح اس سے چھٹکارا حاصل کر لیں۔ یہ دونوں گوشے، صدرِ مملکت کے سامنے تھے ــــ ایک طرف بے پناہ مشقتیں، مصیبتیں، تکلیفیں، اَلْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَ نَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَ الثَّمَرٰتِ (۲/۱۵۵)۔ ہر قسم کے خطرات بھوک۔ پیاس۔ جان۔ مال۔ ثمرات کی تباہیاں تھیں، اور دوسری طرف غلامی، محکومی، ذلت اور مسکنت کی زندگی ــــ اور غلامی و محکومی بھی ہندو جیسی قوم کی ــــ یہ دونوں گوشے اس کے سامنے تھے، اور وہ ایک گہری سوچ میں ڈوبا ہوا بیٹھا تھا ــــ کتنا نازک تھا یہ مقام، اور کیسا مشکل تھا یہ فیصلہ ــــ وہ فیصلہ جس پر دس کروڑ انسانوں کی موت اور حیات، ان کی آنے والی نسلوں کی قسمت، بلکہ اس خطۂ زمین پر

تو وہ اسلام کے مستقبل کا دار و مدار تھا۔ وہ اس گہری سوچ میں ڈوبے بیٹھا تھا کہ ایک طرف سے یہ ندائے جاں اس کے کانوں میں آئی کہ مُوْتُوْا - ثُمَّ اَحْيَاهُمْ (۲/۲۴۳)۔ تم موت کو ترجیح دو۔ ہم تمہیں زندگی عطا کر دیں گے۔ اس نے آنکھیں اوپر کو اٹھائیں تو سامنے نور کی شعاعوں سے لکھا دیکھا کہ لَا تَهِنُوْا وَ لَا تَحْزَنُوْا وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ (۳/۱۳۸)۔ مت گھبراؤ۔ مت خوف کھاؤ۔ چونکہ تم کمزوروں اور مظلوموں کو امن کی ضمانت دینے کے لئے اٹھو گے اس لئے تم یقیناً غالب رہو گے[1]۔

اس نشید حیات آور نے کشمکش کو یکسو کر دیا ــــ عشق کی اک جست نے طے کر دیئے قصے تمام ــــ اور اس صاحبِ عزم و ہمت نے، کامل اعتماد اور یقین کے ساتھ، فریقِ مخالف سے پکار کر کہہ دیا کہ

عشق کو فریاد لازم تھی سو وہ بھی ہو چکی — اب ذرا دل تھام کر فریاد کی تاثیر دیکھ
تو نے دیکھا سطوتِ رفتارِ دریا کا عروج — موجِ مضطر کس طرح بنتی ہے اب زنجیر دیکھ

پاکستان نے بالآخر، ہندوستان کا چیلنج قبول کر لیا۔

پانچ ستمبر کی رات کو ہم سوئے تو یہ رونا روتے ہوئے کہ قوم کی اخلاقی حالت بے حد بگڑ چکی ہے۔ ہر شخص کو اپنے اپنے ذاتی مفاد کی پڑی ہے۔ قوم اور ملک کے اجتماعی مفاد کا کسی کو خیال نہیں حتیٰ کہ عام پھیلائے ہوئے خیالات کے مطابق ہماری فوج بھی سہل انگار اور عیش پرست ہو گئی ہے۔ ایسے میں اگر (خدانخواستہ) ملک پر کوئی آفت آ گئی تو اس کا کیا بنے گا!

۵ ستمبر کی رات کو ہم یہ خیالات لے کر سوئے۔ اور جب ۶ ستمبر کی صبح کو اٹھے تو ایسا محسوس ہوا جیسے ہم کسی اور ہی ملک کے اندر، ایک اور ہی قوم کے فرد ہیں۔ ۱۹۴۸ء میں، جب کسی نے یہ افواہ پھیلا دی تھی کہ امرتسر کی طرف سے ہندوؤں کی فوجیں، لاہور کی سمت مارچ کرتی دیکھی گئی ہیں، تو لاہور خالی ہو گیا تھا۔ لیکن اب ہندوؤں کی فوجیں (عالمِ خیال میں نہیں واقعۃً) لاہور کے سر پر تھیں۔ باٹا نگر پر بم پڑ چکا تھا۔ دشمن کی توپوں کے دھماکے سے ہمارے در و دیوار ہل رہے تھے۔ یوں دکھائی دیتا تھا کہ چند ساعتوں میں، دشمن کے ٹینک شہر کے گلی کوچوں میں پھر رہے ہوں گے۔ یہ حالات تھے، لیکن حرام جو کسی سمت سے خوف اور ہراسانی کا شائبہ تک بھی دکھائی دیا ہو۔ تمام اہلِ شہر، کامل سکون اور سکوت کے ساتھ اپنے اپنے کاروبار میں مصروف تھے۔ نوجوان ان ایمان افروز ولولوں کو لئے ہوئے کہ خدا کا شکر ہے کہ زندگی میں ایسا موقعہ آ گیا۔ جب ہم دنیا کو بتا سکیں گے کہ

آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا

بوڑھے اس عزم و ثبات کو لئے ہوئے کہ ہم "بنیان مرصوص" کی طرح ڈٹے رہیں گے اور اس آہنی دیوار کو کوئی توڑ نہیں سکے گا۔ بچے یہ ولولہ انگیز نغمات گاتے ہوئے کہ ــــ بہادر و بڑھے چلو ــــ سپاہیو بڑھے چلو ــــ اور عورتیں، سپاہیوں کے لئے ہر قسم کا سامان فراہم کرنے میں مصروف ــــ اور یہ سب کچھ نہایت نظم و ضبط کے ساتھ۔ ان سطور کی تحریر کے وقت جنگ شروع ہوئی کو قریب دو ہفتے گزر چکے ہیں۔ اس دوران میں کوئی رات ایسی نہیں گزری جب توپوں کی آواز نے دیوار یں

---

[1] مؤمن کے معنی امن کی ضمانت دینے والا بھی ہیں۔

نہ ہلادی ہوں - اور کوئی دن ایسا نہیں آیا جب سائرن کی کپکپا دینے والی آواز کان میں نہ پڑی ہو - لیکن اس وقت تک ایک لمحہ بھی ایسا نہیں آیا جب قوم کے دل کی دیواریں ذرا بھی ہلی ہوں یا ان کی روح میں شمہ بھر کپکپی پیدا ہوئی ہو - حوصلے ہیں کہ دن بدن بلند ہو رہے ہیں اور ہمتیں ہیں کہ ساعت بساعت استوار ہو رہی ہیں - عام حالات ہیں، ہر صبح اخبارات میں، دو چار واردات کی خبر سامنے آجاتی تھی - لیکن ان دنوں میں کسی ایک واردات کی خبر سننے میں نہیں آئی - اشیائے خورد و نوش، بغیر کسی دقت اور مشقت کے مل رہی ہیں، اور انہی قیمتوں پر مل رہی ہیں - (بلکہ بعض چیزیں سستی ہو گئی ہیں) اور یہ حالت ایک لاہور ہی کی نہیں - سارے ملک کا یہی عالم ہے -

عقل حیران ہے کہ یا اللہ! کیا یہ وہی قوم ہے جس کا ہم رونا روتے پانچ ستمبر کی رات کو سوئے تھے؟ کیا یہ وہی ملک ہے جس کے کونے کونے میں، ہر قسم کی خرابیاں دکھائی دیتی تھیں یہ راتوں رات ہی میں کیا انقلاب آگیا؟ یہ شباشب اس کی قلب ماہیت کیسے ہو گئی؟

اور ہمارے سپاہی!

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے میری زباں کے لئے

انہوں نے جو کچھ کر کے دکھایا ہے، اس سے دنیا کی تاریخ میں، ایک سنہرے باب کا اضافہ ہو گا اور آنے والی نسلیں ان کے محیر العقول کارناموں کو مثال کے طور پر بیان کیا کریں گی - اقبالؒ زندہ ہوتا تو وہ دیکھتا کہ اس کی دعائیں کہ

جوانوں کو میری آہِ سحر دے
پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے

کس طرح بدرگاہ رب العزت مستجاب ہوئی ہیں اور اس کے ان "شاہین بچوں" کے بال و پر نے، دشمن کے فضائیہ میں کیا قیامتیں برپا کر دی ہیں - ان کا — پلٹنا، جھپٹنا، جھپٹ کر پلٹنا — زمانہ امن میں بیشک — لہو گرم رکھنے کا تھا اک بہانہ — لیکن میدانِ کارزار میں، ان کی اس پلٹ اور جھپٹ نے جس طرح قوم کی تقدیر کو پلٹ دیا ہے، اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا -

اقبال نے کہا تھا کہ

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے اس کو اپنی منزل آسمانوں میں

اس سے پہلے، اسے محض ایک شاعر کا تخیل سمجھا جاتا تھا — حالانکہ وہ بار بار کہتا تھا کہ — حقیقت ہے نہیں میرے تخیل کی یہ برّاقی — لیکن ہماری فضائی - بری اور بحری فوج کے جوانوں نے اس تخیل کو ایک جیتی جاگتی حقیقت میں تبدیل کر کے دکھا دیا -

اقبالؒ نے کہا تھا کہ

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ روح الامیں پیدا

دنیا سمجھتی تھی کہ یہ محض ایک فلسفی کا نظریہ ہے جسے حقیقت سے کچھ واسطہ نہیں ہوتا، لیکن ہمارے ان کوہ شکن مجاہدین نے یہ ثابت کر دیا کہ یہ ایک نظریہ نہیں، حقیقت ہے۔

قرآن نے کہا تھا کہ کَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِينَ ○ (۲/۲۴۹) ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک قلیل سی جماعت، ایک جمِ غفیر پر غالب آجاتی ہے۔ یہ ہوتا ہے خدا کے اس قانون کے مطابق جس کی رُو سے اس کی نصرت ان کے ساتھ ہوتی ہے جو ثابت قدم رہیں۔ انہی کے متعلق کہا تھا کہ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ..... (۸/۶۵)۔ اگر تم میں بیس سپاہی ثابت قدم ہوں گے تو وہ دشمن کے دو سو پر غالب آجائیں گے۔ اس "ایک اور دس" کی نسبت کے لئے ہم اپنے صدرِ اوّل کے مجاہدین کی درخشندہ داستانیں اپنے بچوں کو سنایا کرتے تھے لیکن اب انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ یہ دعوے کس قدر صداقت پر مبنی ہے۔

ملت پاکستانیہ کی اس قلب ماہیت پر بالعموم، اور اس کی افواجِ قاہرہ کی محیر العقول سرفروشانہ جوشش کردار پر بالخصوص، آنے والا مؤرخ، محوِ حیرت ہوگا اور اس کی بنیادی علت (CAUSE) کے لئے بڑی کرید کرے گا لیکن ہمیں اس کی تلاش میں کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں۔ وہ قوم جس میں زندگی کی حرارت باقی ہوتی ہے، اس کے تحت الشعور میں ..... اس کی درخشندہ روایات[1] محوِ خواب ہوتی ہیں، اور تاریخ کے نازک موڑ پر وہ اس طرح بیدار ہو جاتی ہیں جس طرح بربط کے تاروں میں چھپے ہوئے نغمے۔ ایک جنبشِ مضراب سے فضا میں ارتعاش پیدا کر دیتے ہیں۔ سطحِ بیں نگاہیں ساکت و صامت تاروں کو دیکھتی ہیں۔ لیکن ان کے اندر مضمر نغموں کو نہیں بھانپ سکتیں۔ جنگ یا اسی قسم کے اور حوادث، قوموں کے عروقِ حیات کے لئے مضراب کا کام دیتے ہیں اور ان میں پھر سے خونِ زندگی بڑی تیزی سے گردش کرنے لگ جاتا ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے قرآن کریم نے، جنگ کی طرف دعوت دیتے ہوئے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ ..... (۸/۲۴)

اے ایمان والو! تم خدا اور رسول کی اس دعوت پر لبیک کہو جو تمہیں زندگی عطا کر دے گی۔

جنگ کے لئے بلاوے کو، زندگی عطا کرنے والی دعوت کہنا اسی حقیقت کی ترجمان ہے۔ قوم کو اپنی مضمر صلاحیتوں اور غیر محسوس خصوصیتوں کا اندازہ ہی معرکہ آرائی سے ہو سکتا ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر — تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریفِ سنگ
یہ زورِ دست و ضربتِ کاری کا ہے مقام — میدانِ جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ
خونِ دل و جگر سے ہے سرمایۂ حیات — فطرت "لہو ترنگ" ہے غافل نہ "جل ترنگ"

---

[1] مسلمانوں کی صورت میں، ان روایات سے مراد ہے قرآن کی عطا کردہ مستقل اقدار کا کسی وقت محسوس پیکر میں سامنے آنا۔

اسی لئے قرآن کریم نے درخور صلوٰۃ وسلام ان مجاہدین کو قرار دیا ہے جو اس قسم کے زلزلہ انگیز، صبر آزما اور ہمت طلب معرکوں میں ثبات واستقامت کا ثبوت دیں۔ (۳/۱۵۵)۔ قتال فی سبیل اللہ — جو جہاد کی آخری کڑی ہے — جنت کی کلید اور حیات جاودانی کی ضمانت ہے اس لئے کہ اسی سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ انسانی ذات میں کس قدر پختگی پیدا ہو چکی ہے اور وہ زندگی کے آیندہ بلند مراحل طے کرنے کے قابل کس حد تک ہوئی ہے۔ اگر انسانی ذات کو اس کسوٹی پر نہ کسا جائے تو ہو سکتا ہے کہ انسان اپنی ذات کی نشو و نما کے متعلق خود فریبی میں مبتلا ہو جائے۔ یہی وہ خود فریبی ہے جس کے متعلق علامہ اقبالؒ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

> اسلام جہاد فی سبیل اللہ کو حیات کے لئے ضروری تصور کرتا ہے تو شعرائے عجم اس شعار اسلام میں کوئی اور معنی تلاش کرتے ہیں۔ مثلاً
>
> غازی ز پئے شہادت اندر تگ و پوست
> غافل کہ شہید عشق فاضل تر ازوست
> در روز قیامت ایں بادے کے ماند
> ایں کشتۂ دشمن است و آں کشتۂ دوست
>
> یہ رباعی شاعرانہ اعتبار سے نہایت عمدہ ہے اور قابل تعریف۔ مگر انصاف سے دیکھئے تو جہاد اسلامیہ کی تردید میں اس سے زیادہ دل فریب اور خوبصورت طریق اختیار نہیں کیا جا سکتا۔ شاعر نے کمال یہ کیا ہے کہ جس کو اس نے زہر دیا ہے اس کو احساس بھی اس امر کا نہیں ہو سکتا کہ مجھے کسی نے زہر دیا ہے بلکہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ مجھے آب حیات پلایا گیا ہے۔ آہ! مسلمان کئی صدیوں سے یہی سمجھ رہے ہیں۔
>
> (مکاتیب اقبال۔ حصہ اول۔ صفحہ ۳۶)

خدا نے، انبیاءؑ اور کتب کے ساتھ الحدید — شمشیر خارہ شگاف — کے نزول کا ذکر کیا ہے (۵۷/۲۵)۔ تو اسی لئے کہ

> اس بیت کا یہ مصرعۂ اول ہے کہ جس میں
> پوشیدہ چلے آتے ہیں توحید کے اسرار

وہ حیات جاوداں کی بشارت مقتولین فی سبیل اللہ کو دیتا ہے، کسی "کشتۂ دوست" کے لئے یہ بشارت نہیں۔ وہ مجاہدین کے ایک ایک عمل کو اپنے ترازو میں تولتا اور اس کا وزن لکھتا چلا جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ:

> اس راہ میں بھوک اور پیاس کی جس تکلیف کو وہ جھیلتے ہیں جو تکان اور مشقت وہ اٹھاتے ہیں۔ ان کا ہر وہ قدم جو اس مقام پر پڑتا ہے جہاں اس کا پڑنا دشمن کے لئے موجب غیظ و غضب ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ ہر وہ نقصان جو انہیں دشمن کی طرف سے پہنچتا ہے۔

ان میں سے ایک ایک چیز ان کے لئے عمل صالح بنتی چلی جاتی ہے (۹/۱۲۰)۔ اور کیوں نہ بنے؟ خدا نے کہا ہے کہ جو شخص کسی ایک جان کو بھی بچا لے، اس کے متعلق یوں سمجھو گویا اس نے پوری کی پوری نوع انسان کو بچا لیا۔ (۵/۳۲)

آپ پورے پاکستان کو ایک طرف رہنے دیجئے اور صرف ایک لاہور کو لیجئے۔ گذشتہ دو ہفتہ اس سولہ لاکھ کی آبادی اور

دشمن کی طرف سے بھیانک موت، کے درمیان صرف ایک دیوار حائل تھی - اور وہ دیوار تھی ہمارے ان جانباز، خود فراموش سپاہیوں کی - انہوں نے جان پر کھیل کر، اس پوری آبادی کو بچا لیا - نہیں! جنرل موسیٰ کے الفاظ میں، پاکستان کی آزادی اور غلامی کے درمیان یہی دیوار کھڑی تھی - انہوں نے اپنی جانیں دے کر، اس عظیم مملکت کی آزادی کو بچا لیا - اور پھر یہ مملکت، ہمارا قومی وطن ہی تو نہیں - یہ ہمارے دین (قرآنی نظام) کا بننے والا گہوارہ بھی تو ہے - اس کی حفاظت دین کی عظیم ترین خدمت ہے۔

یہ ہے جہاد کا مقام ایک مسلم کی زندگی میں!

لیکن جہاد میدانِ جنگ میں، شمشیر بکف نکل کھڑے ہونے کا نام ہی نہیں تقسیم عمل کے لحاظ سے، اس سلسلہ کا ہر کام، جہاد میں شامل ہے۔ جَاهِدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَ أَنْفُسِهِمْ (۹/۴۱) تو قرآن کریم کے بیشتر مقامات میں آیا ہے۔ جان کے جہاد کے لئے نسبتاً کم لوگوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ باقی آبادی، مال کے جہاد میں شریک ہوتی ہے اور جس کے پاس دینے کے لئے مال نہیں، وہ اس پروگرام کی اور مختلف کڑیوں میں حصہ لے سکتا ہے۔ پھر سب سے اہم کڑی ملک میں امن قائم رکھنے اور عوام کا حوصلہ بڑھانے کی ہے۔ دشمن کا سنگین ترین حربہ، سول آبادی میں بددلی پھیلانا ہوتا ہے۔ اس کا موثر ذریعہ افواہیں پھیلانا ہے جن کی روک تھام نہایت ضروری ہے۔ شہری دفاع کے سلسلہ میں تمام قواعد و ضوابط کی شدت سے پابندی بھی اسی سلسلہ کی اہم کڑی ہے۔ علاوہ ازیں، جن لوگوں کا گھر بار اجڑ جاتے۔ جن کا کاروبار بند ہو جائے، جو کسی طرح مفلوج و محتاج ہو جائیں۔ ان کی پوری پوری مدد کرنا، جہاد بالاموال میں شامل ہے۔ غرضیکہ ہر وہ اقدام جو آپ کی مدافعت و تقویت کا موجب ہو اور جس سے دشمن کے منصوبے کمزور ہوں، جہاد ہے۔

ایسے نازک وقت میں، حکومت کی تائید بڑی ضروری ہوتی ہے۔ صدر مملکت کے اس احسان سے تو ہماری آنے والی نسلیں تک سبکدوش نہیں ہو سکیں گی کہ انہوں نے ملک کی عسکری قوت کو اس قدر مستحکم بنا دیا تھا جس کا کسی کو اندازہ تک نہ تھا - اور جنہوں نے ایسے نازک وقت میں اس قدر بلند حوصلگی کا ثبوت دیا ہے۔ اگر کسی وقت حکومت کی طرف سے کوئی ایسا فیصلہ ہو جس سے بفرضِ محال آپ متفق نہ ہوں، تو اسے ہدفِ تنقید نہ بنائیے۔ اصولی اتفاق کا تقاضا ہوتا ہے کہ جزئی اختلافات کو اہمیت نہ دی جائے - اور پھر ایسے وقت میں جب ایک معمولی سی تنقید نہ معلوم کتنے دور رس نقصان کا موجب بن جائے۔ کبائر سے بچنے والوں کی "لمم" (چھوٹی چھوٹی لغزشوں) کو تو خدا بھی قابلِ گرفت قرار نہیں دیتا۔ (۵۳/۳۲)۔ پھر یہ بھی واقعہ ہے کہ جو معلومات اربابِ حل و عقد کے پاس ہوتی ہیں وہ ہمارے پاس نہیں ہوتیں۔ اس لئے ہمارے مقابلہ میں وہ بہتر پوزیشن میں ہوتے ہیں کہ حالات کی مناسبت سے فیصلے کریں۔

جس وقت تک یہ سطور قلمبند ہو رہی ہیں، ہمارے فلک پیما طیاروں اور کوہ شکن افواج کو کسی محاذ پر بھی کسی قسم کی پسپائی یا ناکامی نہیں ہوئی - اور جس عزمِ بلند اور خارہ شگاف ہمت کا انہوں نے ثبوت دیا ہے اس کے پیشِ نظر ہمیں یقین ہے کہ یہ برقِ خاطف، یہ شہابِ ثاقب، یہ آتشیں پرکالے، آخر تک کامیاب و کامران رہیں گے

اور میدانِ کارزار سے فاتح و منصور لوٹیں گے۔ لیکن جنگ بہرحال جنگ ہے۔ اس میں کسی مقام پر پسپائی بھی ہو سکتی ہے۔ اگر کبھی ایسا ہو تو تمہیں اس سے افسردہ خاطر اور شکستہ دل نہیں ہونا چاہیئے۔ اس قسم کے حوادث تو اس زمانے میں بھی رونما ہو جایا کرتے تھے جب صحابہ کبارؓ جیسے سپاہی اور رسولِ اکرمؐ جیسے کماندار ہوتے تھے۔ انہی نقصانات کے وقت قرآن انہیں یہ کہہ کر اطمینان دلاتا تھا کہ اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ اگر آج تمہیں کوئی زخم لگا ہے تو یقیناً اسی قسم کا زخم تم دشمن کو بھی لگا چکے ہو۔ یہ میدانِ جنگ ہے۔ وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ (۳/۱۳۹)۔ اس میں پلڑے جھکتے اور اٹھتے رہتے ہیں۔ لہٰذا، اگر کسی مقام پر تمہیں ہنگامی طور پر کوئی نقصان پہنچ جائے تو تمہیں گھبرانا نہیں چاہیئے بلکہ سوچنا چاہیئے .... کہ ایسا کیوں ہوا ہے اس لئے کہ وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ (۴۲/۳۰)۔ جو نقصان بھی تمہیں پہنچتا ہے وہ کسی نہ کسی تمہاری اپنی غلطی کی وجہ سے پہنچتا ہے۔ اس لئے ایسے مقام پر گھبرا لینے اور بدحواس ہونے کے بجائے سوچنا یہ چاہیئے کہ وہ نقصان ہماری کس غلطی کی وجہ سے ہوا ہے۔ اور ایسا کرتے وقت، ایک دوسرے کو موردِ الزام بنانے کی کوشش نہیں کرنی چاہیئے۔ اس سے باہمی تنازعہ پیدا ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ اگر ایسا کرو گے فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَاصْبِرُوْا (۸/۴۶)۔ تو تمہاری ہمت ٹوٹ جائے گی اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ اس لئے تم استقامت سے کام لو اور جو غلطی ہو گئی ہے مشترکہ اور متحدہ طور پر اس کی تلافی کی کوشش کرو۔ قوم درحقیقت ایک ٹیم ہوتی ہے ٹیم میں اگر کسی وقت کسی کھلاڑی سے کوئی غلطی ہو جائے تو یہ نہیں ہوتا کہ ساری ٹیم اس کے پیچھے پنجے جھاڑ کر پڑ جائے یا روٹھ کر بیٹھ جائے۔ وہ اس کا خیال کئے بغیر کہ غلطی کس سے ہوئی ہے، اس غلطی کے ازالے کی کوشش کرتی ہے۔ اس لئے کہ نہ تو ٹیم کی شکست کسی ایک کھلاڑی کی شکست ہوتی ہے۔ اور نہ ہی اس کی کامیابی کسی ایک کھلاڑی کی کامیابی۔ شکست اور فتح پوری کی پوری ٹیم کی ہوتی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جس کے متعلق قرآن کریم نے بڑی سختی سے تنبیہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً (۸/۲۵)۔ اس آگ سے بچو جس کی چنگاریاں اڑتی ہیں تو وہ انہیں تک محدود نہیں رہا کرتیں جن سے زیادتی ہوئی ہو۔ وہ ساری کی ساری قوم کو اپنی لپیٹ میں لے لیا کرتی ہیں۔ اس کے برعکس، جہاں تک جنگ میں کامیابی کا تعلق ہے، وہ بیشتر ان جانفروشوں کے خون کے بدلے میں حاصل ہوتی ہے جو یہ پلٹ کر بھی نہیں دیکھتے کہ ان کا خوں بہا [illegible] نے وصول کیا ہے۔ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○ (۳/۱۶۹)۔ وہ جب اس کا احساس کرتے ہیں کہ ان کے جان دے دینے سے، وہ لوگ جو ان کے پیچھے زندہ ہیں، کس طرح امن و اطمینان کی زندگی بسر کر رہے ہیں تو وہ اسے اپنی قربانیوں کا بیش بہا صلہ سمجھتے ہیں اور اس سے بڑے خوش ہوتے ہیں۔ یہی ہیں وہ زندہ جاوید شرف انسانیت کی انتہائی بلندیوں پر فائز مردانِ مومن جن کے خون کی آبیاری سے تاکِ ملت کی نشوونما ہوتی ہے۔ اُولٰٓئِكَ صَلَوٰةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ (۲/۱۵۷)

سر خاکِ شہیدے برگہائے لالہ می پاشم
کہ خونش با نہالِ ملتِ ما سازگار آمد

جب سے صفحۂ ارض پر طلوع و غروبِ آفتاب کا سلسلہ شروع ہوا ہے، دن چڑھتا ہے اور رات پڑتی ہے۔ لیکن ایسا

بعض دن ایسے بھی ہیں جنہیں خدا نے "ایام اللہ" — خود اپنے دن — کہہ کر پکارا ہے۔ یہ "خدا کے دن" وہی ہیں جن میں حق و باطل کی معرکہ آرائیاں ہوتی ہیں۔ اور یہی ہیں وہ دن جن کی یاد دہانی کی تاکید، نبی اکرمؐ کو یہ کہہ کر کی گئی کہ وَ ذَکِّرْهُمْ بِاَیّٰمِ اللّٰهِ ؕ انہیں "خدا کے دنوں" کی یاد دہانی کراتے رہو۔ اس لئے کہ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ (۱۴/۵)۔ اس میں ہر اس قوم کے لئے جو استقامت پذیر ہو اور یہ چاہے کہ اس کی کوششیں بھرپور نتائج کی حامل ہوں، زندگی کی عظیم نشانیاں ہیں — دنیا میں ہر روز ہزاروں انسان آتے اور ہزاروں دنیا سے چلے جاتے ہیں۔ پیدائش اور موت کا یہ سلسلہ لاکھوں برس سے جاری ہے۔ لیکن موت و حیات کے اس بحرِ بیکراں میں وہ نفوس روشنی کے مینار کی طرح جگمگاتے ہیں جن کی موت، لاکھوں کروڑوں انسانوں کے لئے زندگی کا موجب بنتی ہے۔ کس قدر سعادتمند اور خوش بخت ہیں وہ نفوس جنہیں اس قسم کے مواقع میسر ہوں۔

آج ملتِ پاکستانیہ کے سامنے اسی قسم کا معرکہ ہے۔ ہماری نگہ احترام جھکتی ہے،

ان اربابِ حل و عقد کے سامنے جنہوں نے ایسے نازک وقت میں، اس قسم کا صحیح فیصلہ کیا جس کے لئے بڑے آہنی عزم اور بلند حوصلگی کی ضرورت تھی۔

ان جسور و غیور مجاہدین کی بارگاہ میں جو شمشیر بکف اور کفن بدوش میدانِ کارزار میں آ گئے اور جنہوں نے اپنی بے پناہ قربانیوں سے یہ ثابت کر دیا کہ — بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی پوشیدہ ہیں — اور

خود ملتِ پاکستانیہ کے حضور جس نے ایسے ہمت شکن حالات میں، بُنیانِ مرصوص (سیسہ پلائی ہوئی دیوار) کی طرح کھڑے ہو کر بتا دیا کہ

مٹ نہیں سکتا کبھی مردِ مسلماں کہ ہے
اس کی اذانوں سے فاش سرِّ کلیم و خلیل

اور ہمارا سرِ نیاز سجدہ ریز ہے اس خدائے عزیز و رؤف کی بارگاہ میں جس کی عطا کردہ راہ نمائی سے قوم کو ایسی جمعیتِ خاطر نصیب ہوئی کہ جب لوگوں نے اس سے کہا کہ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ۔ دشمن نے تمہارے خلاف لشکرِ جرار جمع کر رکھا ہے۔ اس لئے تم اس سے ڈرو۔ فَزَادَهُمْ اِیْمَانًا۔ تو بجائے اس کے کہ وہ اس سے خوفزدہ ہو جاتی۔ ان کا ایمان اور بڑھ گیا۔ وَ قَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِیْلُ (۳/۱۷۲)۔ اور انہوں نے دل کے پورے یقین سے کہہ دیا کہ دشمن کا لشکر بڑا ہے تو ہوا کرے۔ ہمارے ساتھ قانونِ خداوندی کی تائید و نصرت ہے۔ اور یہ وہ قوت ہے جس پر پورا پورا بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔

اگر ہم نے خدا کی راہ نمائی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا تو اس کا یہ وعدہ یقیناً پورا ہو کر رہے گا کہ فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَضْلٍ لَّمْ یَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ لا (۳/۱۷۳)۔ انہیں دنیا کی کوئی طاقت زک نہیں دے سکے گی اور وہ شاداں و فرحاں، خدا کی عطا کردہ خوشگواریوں سے جھولیاں بھر بھر کر واپس آئیں گے۔ وَ مَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِیْلًا (۴/۱۲۲)۔ خدا سے زیادہ بات کا سچا کون ہے؟

اے دوست سنائے جا بھولے ہوئے افسانے

[جنگ ستمبر ۱۹۶۵ء کے ضمن میں، ریڈیو پاکستان، لاہور نے ایک سلسلۂ تقاریر نشر کیا تھا جس کا عنوان تھا ——— شہر کے لوگ ——— اس سلسلہ میں پرویز صاحب نے ۲۰؍اکتوبر کی شب، ایک تقریر نشر کی تھی جسے ہم، حالات کی مطابقت کے پیشِ نظر، درج ذیل کرتے ہیں]

برادرانِ عزیز! سلامت ورحمت۔

جب سے سورج نے اپنی آنکھ کھولی ہے زمین پر سلسلۂ روز و شب جاری ہے۔ عام حالات میں رات اور دن کی اس گردش لامتناہی کی کیفیت اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی کہ

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے
عمر یونہی تمام ہوتی ہے

لیکن صبح و شام کے اس بے حرکت و بے رنگ سلسلہ میں، بعض دن ایسے بھی آجاتے ہیں جنہیں خدا نے ایام اللہ کہہ کر پکارا ہے۔ یعنی خدا کے اپنے دن۔ یہ "خدا کے اپنے دن" وہ ہیں جن میں حق و باطل کا کوئی فیصلہ کن معرکہ رونما ہوا ہو۔ گذشتہ ستمبر کے سترہ دن ہمارے ہاں بھی ایسے آئے جنہیں بجا طور پر ایام اللہ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ ان میں، حق و باطل کا وہ تاریخی معرکہ سرزد ہوا جس نے پاکستان کی تاریخ ہی کے نہیں بلکہ اسلام کی تاریخ کے صفحات پر اپنا نقش دوام اس طرح ثبت کر دیا ہے کہ گردشِ لیل و نہار کا کوئی حادثہ اسے محو نہیں کر سکتا۔ اس معرکہ میں ہم نے کیا کچھ حاصل کیا۔ اس کی تفاصیل کا بیشتر حصہ اس وقت تک آپ کے سامنے آچکا ہے اور باقی ماندہ آہستہ آہستہ سامنے آتا رہے گا۔ دشمن کے سینکڑوں میل پر مشتمل رقبہ ہمارے قبضے میں ہے۔ ہم نے اس کے لاتعداد ٹینک تباہ کر دیئے اور متعدد صحیح و سالم ہماری گرفت میں ہیں۔ ہم نے اس کے سینکڑوں طیاروں کے پرزے اڑا ڈالے اور بیسیوں ہمارے ہاں پابندِ قفس ہیں۔ اس کے بے شمار قیدی محبوس ہوئے اور بے حد و نہایت اسلحہ اور دیگر سامانِ جنگ بطور غنیمت ملا۔ یہ سب فتوحات بڑی قیمتی ہیں جن پر ہم بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں لیکن ان سب سے زیادہ بیش قیمت متاع ایک اور ہے۔ جو ہمیں اس جنگ سے حاصل ہوئی، وہ متاعِ بے بہا یہ ہے کہ ہم نے خود اپنے آپ کو پالیا۔ صدیوں سے ہماری قوم اپنی نگاہوں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ اُسے اپنے آپ کا علم ہی نہیں تھا۔ اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ اس کے اندر کس قدر ممکنات زندگی مضمر ہیں۔ اُسے احساس تک نہیں تھا کہ وہ کیسی محیر العقول خصوصیات کی حامل ہے۔ وہ کیا کچھ کر سکتی ہے۔ اُسے اس کا مطلقاً اندازہ نہیں تھا۔ ہم پانچ ستمبر کی شام کو سوئے تو اسی قوم کے افراد تھے۔

لیکن جب ۶ ستمبر کی صبح کو بیدار ہوئے تو وہ کوئی اور ہی قوم تھی۔ ریاض خیر آبادی نے کہا تھا کہ

صد سالہ دورِ چرخ تھا ساغر کا ایک دور
نکلے جو میکدہ سے تو دنیا بدل گئی!

۶ ستمبر کی صبح دشمن کی توپوں کی گرج نے جو فضا کے پردے چاک کئے ہیں تو ہمارے سامنے ایک اور ہی دنیا تھی۔ ۱۹۴۷ء کے قیامت خیز ہنگاموں میں ہمیں اپنے آپ کی تھوڑی سی جھلک دکھائی دی تھی لیکن اس کے بعد ہم اپنی نگاہوں سے یکسر اوجھل ہو گئے۔ نتیجہ اس کا یہ کہ دنیا کی کوئی خرابی ایسی نہیں تھی جو ہمیں اپنے اندر دکھائی نہ دیتی ہو۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہم میں بعض خرابیاں فی الواقعہ موجود تھیں لیکن ایک مسلسل پراپیگنڈے نے ہمارے اندر ایک ایسا احساسِ کمتری پیدا کر دیا کہ ہمیں یقین ہو گیا کہ ہم دنیا کی ناکارہ ترین قوم ہیں۔ ہم میں کوئی خوبی ہی نہیں۔ ہم کچھ کر ہی نہیں سکتے۔ رفتہ رفتہ ہمیں اپنے آپ سے نفرت ہو گئی۔ ہمیں پاکستانی کہلاتے ہوئے شرم محسوس ہونے لگی۔

اس احساسِ کمتری کو دور کرنے کے لئے قرآن کریم کی راہ نمائی ہمارے سامنے تھی۔ وہ ہمیں جھنجوڑ جھنجوڑ کر کہہ رہا تھا کہ وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○ (۳/۱۳۹)۔ تم گھبراتے کیوں ہو۔ تم افسردہ خاطر کیوں ہوتے ہو۔ اگر تم قوانینِ خداوندی کی صداقت پر یقینِ محکم رکھ کر خود اعتمادی پیدا کر لو تو تم پر کوئی غالب نہیں آ سکتا۔ وہ ہم سے بار بار کہتا تھا کہ تم اپنی تعداد کی کمی سے مت گھبراؤ۔ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ (۸/۶۵)۔ اگر تم میں بیس ثابت قدم مجاہد ہوئے تو وہ دشمن کے دو سو سپاہیوں پر غالب آ جائیں گے۔ ہم ان آیات کو پڑھتے اور ان کی تلاوت کا ثواب حاصل کر کے قرآن کو پھر بالائے طاق رکھ دیتے۔ تاریخ میں ہمارے سامنے ہمارے اسلاف کے وہ محیر العقول کارنامے آتے جنہیں ہمارے لئے نمونہ بننا تھا۔ ہم ان کارناموں کو پڑھتے تو اپنی بے عملی اور دوں ہمتی کو اس خود فریبی کے پردے میں چھپا کر آگے بڑھ جاتے کہ یہ سب کچھ معجزات اور کرامات کی رو سے ہوا تھا۔ اب وہ معجزے کس سے سرزد ہو سکتے ہیں؟

ہمارا حکیم الامت ہم سے بار بار کہتا کہ

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوب گماں تو ہے

لیکن ہم اسے ایک شاعر کا سہانا خواب کہہ کر حوالۂ طاؤس و رباب کر دیتے۔ یہ کچھ ہوتا رہا اور ہم بدستور سوئے رہے۔ لیکن ۶ ستمبر کی صبح کو توپوں کے ایک ہی دھماکے نے ہماری آنکھیں کھول دیں اور قوم کے تحت الشعور میں خوابیدہ قوتیں اس طرح ابھر کر سامنے آ گئیں جس طرح بربط کے خاموش تاروں میں چھپے ہوئے نغمے مضراب کی ایک ضرب سے فضا میں ارتعاش پیدا کر دیتے ہیں۔ ہم نے اپنے ثریا شکار طیاروں کے جاں فروش شاہین بچوں کو دیکھا تو وہ اس حقیقت کی عملی تفسیر تھے کہ

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ روح الامیں پیدا

ہم نے اپنی بری اور بحری فوجوں کے جانبازوں پر نگاہ ڈالی تو ان کا جوشِ عمل پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ

مثلِ کلیم ہو اگر معرکہ آزما کوئی
اب بھی درختِ طور سے آتی ہے بانگِ لاتخف

ہم نے اپنی قوم کی طرف دیکھا تو وہ ہمت، استقامت، عزم، ایثار، بلند حوصلگی، کشادہ دلی، خود فراموشی اور اقدار پرستی کی چلتی پھرتی تصویر تھی۔ قوم کیا تھی۔ ایک ٹیم تھی، جس کے ہر کھلاڑی کے سامنے ایک ہی مقصد تھا۔ یعنی اپنی ٹیم کی کامیابی اور فریق مقابل کی شکست۔ آسمان کی آنکھ اس قوم کو دیکھ کر ششدر و حیران تھی اور اسے یقین نہیں آتا تھا کہ یہ وہی قوم ہے جسے اس نے گذشتہ شب کی تاریکی میں لپیٹ کر سلایا تھا!

یہ ہے برادرانِ عزیز! وہ متاعِ بے بہا جو ہمیں اس معرکۂ حق و باطل سے حاصل ہوئی ہے۔ ہم نے اپنے آپ کو پا لیا ہے۔ قرآن کریم نے کہا تھا۔ وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (۵۱/۲۱)۔ تم معجزات اور کرامات کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہو۔ تم خود اپنے اندر جھانک کر دیکھو۔ اس میں تمہیں ایسی ایسی محیر العقول قوتیں نظر آئیں گی جن کا تم قیاس و گمان بھی نہیں کر سکتے۔ ہم نے اپنے اندر جھانک کر دیکھا تو فی الواقعہ وہاں ان قوتوں کا بے بہا ذخیرہ تھا۔ ان سے ہمیں اس حقیقت کا اندازہ ہوا کہ ہمارے اسلاف سے جو معجزانہ کارنامے سرزد ہوئے تھے وہ ان کے ذوقِ یقین اور جوششِ کردار کے مظاہرے تھے۔ وہی تجربے ہم سے بھی سرزد ہو سکتے ہیں بشرطیکہ ہمیں بھی اپنے مقصد کی صداقت پر یقینِ محکم حاصل ہو۔ اور اس مقصد کے حصول کے لئے جذبۂ عمل بیدار ہو۔ اسی سے وہ حقیقت بھی ہمارے سامنے آ گئی جسے علامہ اقبال نے ان الفاظ میں پیش کیا تھا کہ

محکوم کو پیروں کی کرامات کا سودا
ہے بندۂ آزاد خود اک زندہ کرامات

سوال یہ ہے کہ ان بے پناہ قوتوں کو جو ہم میں ہنگامی طور پر بیدار ہوئی ہیں، مستقل متاعِ حیات کیسے بنایا جائے۔ ہمارے مستقبل کا دار و مدار اسی سوال کے اطمینان بخش جواب پر ہے اور یہ جواب قرآن کے علاوہ اور کہاں سے مل سکتا ہے؟

والسلام (بشکریہ ریڈیو پاکستان)

کاغذ کی کمیابی

ہمارے ہاں ہنگامی حالات کی وجہ سے کاغذ کی پہلے ہی کمی تھی۔ اب سقوطِ مشرقی پاکستان کے بعد اس کی قلت اور بھی بڑھ جائے گی۔ طلوع اسلام کو جو کوٹہ پہلے ملتا تھا، اس ماہ اس میں بھی کمی کر دی گئی اور ہمیں بقایا کاغذ دگنی قیمت پر خریدنا پڑا۔ اسی وجہ سے ہم رسالہ کو ٹائیٹل کے بغیر شائع کر رہے ہیں۔ اس کی زندگی میں پہلی بار ایسا ہوا ہے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس کے بعد کاغذ کی کیا صورت ہوگی۔ لیکن جو صورت بھی ہو، ہم تا بحدِ امکان کوشش کریں گے کہ رسالہ کی اشاعت جاری رہے، بالخصوص اس لئے کہ اس وقت ملک جن ہنگامی حالات سے دوچار ہے، ان میں قوم کو قرآنی راہ نمائی کی اشد ضرورت ہے اور یہ راہ نمائی اسے طلوع اسلام کے سوا اور کہیں سے نہیں مل رہی۔ ہمیں امید ہے کہ اس نازک مرحلے میں قارئین ہم سے پورا پورا تعاون کریں گے۔ اور اگر رسالہ کے معمول میں کچھ فرق آئیگا تو اسے خندہ پیشانی سے برداشت کریں گے۔ ادارہ اس کے لئے آپ کا شکر گزار ہوگا۔

(ناظم ادارہ طلوع اسلام)

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں

[جنگ ستمبر ۱۹۶۵ء میں، پاکستانی فضائیہ نے جو محیر العقول اور معجز نما کارنامے سر انجام دیئے تھے ان کی یاد صفحہ تاریخ سے محو نہیں ہو سکتی۔ حالیہ جنگ میں بھی ہماری فضائیہ نے (ان سطور کی تحریر تک، جو معرکے مارے ہیں) انہوں نے ان کے اپنے سابقہ ریکارڈ کو بھی توڑ دیا ہے۔ ان کے یہ کارنامے اور معرکے تو ہر ایک کو یاد ہیں لیکن اس کا علم بہت کم لوگوں کو ہے کہ پاکستان فضائیہ نے اپنی ابتدا کن حالات میں کی تھی اور اس نے کن مشکلات سے گزر کر تشکیل پائی تھی۔ جب یہ معلومات سامنے آئیں تو فضائیہ کی عظمت اور بھی نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔ جنگ ستمبر ۱۹۶۵ء کے سلسلہ میں، محترم عنایت اللہ صاحب نے اس ضمن میں بڑی اہم معلومات فراہم کی تھیں جن پر مشتمل ایک مقالہ، طلوع اسلام، بابت فروری ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا تھا۔ تجدید یادداشت کے لئے اسے دوبارہ شائع کرنے کی سعادت حاصل کی جاتی ہے۔]

آغازِ سفر

عام طور پر ذہنوں میں یہ ہے کہ تقسیم ہند کے بعد جب بٹوارہ ہوا ہے۔ تو ہمارے حصے کا پورا سامان اور اسلحہ ہمیں مل گیا تھا اور اس سے ہم نے اس نوزائیدہ مملکت کی ابتدا کی تھی۔ لیکن یہ درست نہیں۔ اس وقت تمام سامان ہندوستان میں تھا۔ اور ہندو کی ذہنیت کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ سنئے۔ کہ جہاں تک فضائیہ کا تعلق ہے ہمارے حصے میں کیا آیا تھا اور وہ ہمیں کس طرح دیا گیا تھا۔۔۔ عنایت صاحب لکھتے ہیں۔

بھارت کی پاکستان دشمنی کے مظاہرے تو روزِ اول سے ہی شروع ہو گئے تھے۔ جس کی بدترین اور شرمناک مثالیں پاک فضائیہ کے ابتدائی اور کٹھن باب میں ہمیشہ یاد کی جایا کریں گی۔ ایک تو ہمارے حصے میں ٹمپسٹ (TEMPEST) قسم کے ونٹیج طیاروں کی انتہائی قلیل تعداد آئی تھی اور ان کی ٹیکنیکی دیکھ بھال کے لئے زمینی سٹاف بالکل ہی ناکافی تھا۔ ہندو اور سکھ ہواباز بھی بھارت واپس جا رہے تھے اور خبریں مل رہی تھیں کہ وہ سٹوروں سے بھی اور طیاروں میں سے بھی اہم اور نایاب کل پرزے (سپیئر پارٹس) نکال کر ساتھ لئے جا رہے ہیں چنانچہ چند ایک مسلمان ہوابازوں نے اپنے طیاروں کی چوکیداری شروع کر دی۔

پاکستان کے ہوائی اڈے سوائے پشاور کے سب غیر آباد ہو گئے تھے۔ کہیں کہیں اکا دکا طیارہ پڑا تھا۔ گو وہ بیکار تھے۔

ان کے انجن کام آسکتے تھے۔ ہندو ہواباز جاتے جاتے ان طیاروں میں برقی ڈرلوں سے سوراخ کر کے بیکار بنا گئے۔ صرف طیاروں کو ہی نہیں انہوں نے بعض اڈوں پر فلائنگ کنٹرول کے وائرلیس سسٹم کو بھی بیکار کر دیا تھا — ان قیمتی چیزوں اور جگہوں کی چوکیداری کون کرتا؟ — مسلمان ہواباز جنہیں پاکستان ایرفورس میں آنا تھا بھارت کے مختلف ہوائی اڈوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ ان کے زندہ وسلامت پاکستان پہنچ جانے کے امکانات بھی کم ہی تھے۔

پاکستان کے پاس نہ کوئی تربیتی طیارہ تھا۔ نہ کوئی انسٹرکٹر، نہ فلائنگ ٹریننگ سکول، نہ ٹیکنیکل ٹریننگ سینٹر۔ پرواز کی تربیت کے دو سنٹر (ابتدائی جودھ پور، اور اعلیٰ انبالہ) بھارت میں رہ گئے تھے۔ وہاں جدید سسٹم کے تمام لوازمات موجود تھے۔ جو دور حاضر کے ہواباز کی تربیت کے لئے ضروری ہوتے ہیں۔ تجربہ کار انسٹرکٹر بھی وہیں رہ گئے تھے۔ کیونکہ وہ مسلمان نہیں تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ بھارت کو بنی بنائی تیار بر تیار ہوائی فوج مل گئی تھی اور اس کے روزمرہ کے معمولات میں ذرہ بھر فرق نہ آیا تھا۔ پاکستان کی فضائی طاقت نہ ہونے کے برابر تھی۔ بھارت نے ہمارا ساز و سامان روک لیا تھا۔ ایک دن ہمیں یہ خوش خبری ملی کہ بھارت سے وہ راکٹ اور امیونیشن آ رہے ہیں جو ہمارے حصے میں آئے ہیں۔ جب یہ ساز و سامان پہنچا تو کئی پیٹیوں اور صندوقوں میں سے پتھر نکلے۔ پھر ایک اور خوشخبری سنائی گئی۔ کہ ہمارے حصے میں آٹھ ٹائیگر ماتھ طیارے آئے ہیں۔ ٹائیگر ماتھ دو پروں کا وہ طیارہ ہے جو پہلی عالمی جنگ سے ذرا پہلے ایجاد ہوا تھا۔ اس کی پرواز ہواؤں اور موسموں کے رحم و کرم پر ہوتی ہے۔ مخالف سمت سے ہوا کا ایک تیز جھونکا آ جائے۔ تو ٹائیگر ماتھ ہوا میں معلق رہ جاتا ہے۔ اس وقت کی برطانوی ہندی فضائیہ میں یہ قدیم طیارے تربیت کے لئے استعمال کئے جاتے تھے۔ بھارت نے اطلاع دی تھی کہ اپنے ٹائیگر ماتھ جودھپور سے لے جاؤ۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ انہیں جودھ پور میں ہی پڑا رہنے دو۔ اتنی دور اڑا کے کیسے لیجاؤ گے؟

ٹائیگر ماتھ کی رفتار خوشگوار اور پرسکون موسم میں ساٹھ ستر میل فی گھنٹہ سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اور اگر موسم کے تیور بدل جائیں تو اسے اتار لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا اس کی ایک اڑان بمشکل سو میل تک ہوتی ہے۔ ان آٹھ ٹائیگر ماتھوں کو جودھ پور سے سینکڑوں میل دور رسال پور لانا تھا۔ ہمارے پاس اتنے ہواباز بھی نہیں تھے۔ جو انہیں جا کے اڑا لاتے۔ بھارت نے ہمارے ساتھ عملی مذاق کیا تھا۔

پاکستان فضائیہ کا ایک ڈکوٹہ طیارہ (مسافر بردار) دو پاکستانی فلائنگ افسروں اور زمینی عملہ کے دو ارکان کو لے کے جودھ پور پہنچا۔ وہاں کے ٹریننگ سنٹر میں دو چار مسلمان کیڈٹ (زیر تربیت ہواباز) تھے۔ انہوں نے ابھی دو گھنٹوں کی بھی پرواز نہیں کی تھی۔ ان کی حالت ان بچوں کی سی تھی جنہوں نے ابھی بمشکل کھڑے ہونا سیکھا ہو۔ اور ان سے دوڑنے کی توقع رکھا جائے۔ کوئی چارہ نہ تھا۔ انہیں شاہین بچوں کو ٹائیگر ماتھوں کی سینکڑوں میل کی مسلسل پرواز کا انتہائی نازک اور پرخطر فرض سونپ دیا گیا۔ دو طیاروں کو دونوں فلائنگ افسروں نے سنبھال لیا۔ اور چھ میں ایک ایک کیڈٹ بیٹھ گیا۔ ڈکوٹے میں پٹرول کے چند کنستر رکھ لئے گئے۔

اگر بھارت والے ان طیاروں کو جگہ جگہ پٹرول مہیا کرنے کا بندوبست کر دیتے۔ تو بھی کوئی مشکل نہیں تھی۔ لیکن عداوت کی ایسی فضا پیدا ہو گئی تھی۔ کہ ہمارے ہوابازوں کو ہندو قہر آلود اور حقارت آمیز نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ اور انہیں کوئی پانی کا ایک گھونٹ پلانے پر بھی آمادہ نظر نہ آتا تھا۔ ان تمام مشکلات کے باوجود یہ قافلہ فضا کے انتہائی پرخطر سفر پر روانہ ہو گیا۔ آٹھ ٹائیگر ماتھوں کے اوپر ایک ڈکوٹہ اڑ رہا تھا جس کی رفتار ان طیاروں سے تین چار گنا زیادہ تھی۔

ڈکوٹہ ان کے اوپر چکر کاٹ کر ان کا ساتھ دے رہا تھا۔

نیچے بھارتی ہواباز یقیناً ہنس رہے ہوں گے۔ اور اس خبر کا بیتابی سے انتظار کر رہے ہوں گے کہ آٹھوں ٹائیگر ماتھ راستے میں تباہ ہو گئے ہیں۔ اگر وہ ہنسے تھے۔ تو حق بجانب تھے۔ کیونکہ راستے میں ان کی خباثت کا انکشاف ہوا۔ انہوں نے ہمارے ٹائیگر ماتھوں کی تباہی کا سامان کر رکھا تھا۔ چنانچہ اوپر فضا میں ایک ٹائیگر ماتھ کا انجن بند ہو گیا۔ غیر تربیت یافتہ کیڈٹ نے طیارے کو بند انجن سے ہی گائیڈ کر کے اتار لیا۔ خوش قسمتی سے نیچے ہموار علاقہ تھا۔ جنگل یا پہاڑ نہیں تھے۔ ڈکوٹے جیسے بڑے طیارے کے اترنے کے لئے قدرے بہتر زمین کی ضرورت ہوتی ہے لیکن ہوابازوں نے خطرہ مول لے کر ڈکوٹہ بھی اتار لیا۔ جب ٹائیگر ماتھ میں پٹرول ڈالنے لگے تو دیکھا کہ پٹرول کی ٹینکی میں چینی پڑی ہوئی ہے۔ چینی ایک ایسی چیز ہے جو پٹرول میں حل نہیں ہوتی اور نالیوں کو بند کر دیتی ہے۔ بڑی مشکل سے ٹینکی صاف کی گئی اور اس میں ایک کنستر پٹرول انڈیلا گیا۔ اور طیارہ فضا میں بلند ہو گیا۔

ذرا آگے جا کر ایک اور ٹائیگر ماتھ کا انجن بند ہو گیا۔ اسے بھی بند انجن سے ہی محفوظ اتار لیا گیا۔ اس کی ٹینکی میں ریت پڑی ملی۔ کوشش کے باوجود ساری ریت ٹینکی سے نکل نہ سکی اور نالیاں صاف نہ ہو سکیں اس طیارے کو بھارت کے علاقے میں پھینک دیا گیا اور اس کا ہواباز ڈکوٹے میں بیٹھ گیا۔

سات ٹائیگر ماتھ ایک ڈکوٹے کے نیچے یوں جھومتے جھولتے، ڈگمگاتے اڑے جا رہے تھے۔ جیسے ننھے ننھے بچوں کو گھر سے نکال کر جنگل کی طرف دھکیل دیا جائے۔ اور ان کی بے بس اور دکھیاری ماں بے بسی میں ساتھ چلی جا رہی ہو۔

راجپوتانہ کے اوپر کا سفر بہت کٹھن اور خطرناک تھا۔ نیچے ریگزار تھا جہاں طیارہ اتر تو سکتا تھا۔ لیکن وہاں سے اٹھ نہ سکتا تھا۔ کیونکہ پہیے ریت میں پھنس کر رفتار نہیں پکڑ سکتے تھے۔ وہاں بھی ٹائیگر ماتھوں کا باری باری پٹرول ختم ہوا۔ اور وہ نیچے اترے۔ ڈکوٹہ کو اچھی زمین کی تلاش میں ان سے بہت دور اترنا پڑا۔ اور ہواباز کنستر اٹھا کر پیدل ٹائیگر ماتھوں تک گئے۔ پٹرول ڈالا اور انہیں بڑے بڑے جتنوں سے ریگستان سے اٹھایا۔ یہ مشکل ایک بار نہیں بلکہ کئی بار پیش آئی۔

مشرقی پنجاب کے اوپر سے اُڑ کر آنا اور زیادہ خطرناک تھا۔ کیونکہ نیچے ہندو، سکھ مسلمانوں کے قتل عام میں مصروف تھے۔ وہاں طیاروں کو پٹرول کے لئے اتارنا خودکشی کرنے والی بات تھی۔ طیارے سندھ کے اوپر سے میانوالی کی طرف سے رسالپور پہنچائے گئے۔ لیکن دو ٹائیگر ماتھ راستے میں ہی پھینکنے پڑے۔ بھارت کی چینی اور ریت کام کر گئی تھی۔

ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات

اس سے ہم نے اپنے فضائیہ کی ابتدا کی۔ یہ ۱۹۴۷ء کا ذکر ہے۔ اور ۱۹۴۸ء میں ہمارے ان شاہین بچوں کی پہلی آزمائش کا وقت آ گیا۔ اس میں انہوں نے اپنے بال و پر کا مظاہرہ کس نہج سے کیا۔ اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگایئے۔

پاکستانی فضائیہ کے ہوابازوں نے اب ہی نہیں ابتدا میں ہی اپنے جوہر دکھلانے شروع کر دیئے تھے۔ مثلاً ۱۹۴۸ء میں جنگ کشمیر کے دوران بھارت نے اپنی پوری کی پوری فضائی قوت استعمال کی تھی۔ لیکن پاکستان نے مجاہدین

کی مدد کے لئے اپنا ہوائی بیڑہ وقف کر رکھا تھا۔ اسی دوران ہمارا ایک ہواباز ڈکوٹہ طیارے میں کچھ دوائیاں اور اسی طرح کا انسانی بھلائی کا سامان کشمیری مجاہدین کے لئے پیراشوٹوں سے پھینکنے کشمیر کی فضا میں گیا۔ تو بھارت کے دو لڑاکا طیاروں نے اسے فضا میں گھیر لیا اور اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ ڈکوٹہ مسافر اور باربردار طیارہ ہے اور بالکل نہتہ ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہلکی سی مشین گن بھی نہیں ہوتی۔ جس سے ہواباز اپنے دفاع میں لڑ سکیں۔ دشمن کے طیاروں کے نرغے میں آ کر اپنے آپ کو ان کے رحم و کرم پر چھوڑ دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ لیکن ہمارے ہواباز نے بھارت کے ہوابازوں کو وائرلیس پر للکار کر کہا۔ "میں تمہارے ہاتھ نہیں آؤں گا"۔ اور وہ غوطے میں چلا گیا۔ لڑاکا طیاروں نے ڈکوٹے پر حملہ کر دیا اور دونوں نے نہتے ڈکوٹے پر بے طرح گولیاں برسائیں۔ سکواڈرن لیڈر اور اس کے معاون ہواباز نے فضا میں پینترے بدل بدل کر ڈکوٹے کو نیچے وادی میں درختوں کی بلندی تک اڑا اڑا، اور اٹھا اٹھا کر دشمن کے ہر وار کو بیکار کیا۔ لڑاکا طیاروں نے ہمارے ڈکوٹے پر مکمل پینتیس (۳۵) منٹ تک جھپٹے مارے۔ لیکن ہر جھپٹا ناکام رہا۔ آخر ان کی ایک بوچھاڑ کی چند گولیاں ڈکوٹے میں ایسی لگیں کہ اندر بیٹھے ہوئے سپلائی کور کے ایک جمعدار کو شہید کر گئیں۔ ڈکوٹہ واپس آ گیا۔ اسے جو نقصان پہنچا تھا۔ وہ گراؤنڈ سٹاف نے چند گھنٹوں میں مرمت کر لیا۔ اور اگلے روز ڈکوٹہ پھر اڑنے لگا۔

مومنے بالائے ہر بالا ترے

چند ہی سالوں کی تربیت کے بعد یہ آسمان پرواز کیا سے کیا بن گئے۔ یہ داستان بھی سننے کے قابل ہے۔

آٹھ دس برس پیشتر انگلستان میں دولت مشترکہ کے تمام ممالک کے ہوابازوں کا راکٹ اور گن فائرنگ کا فضائی مقابلہ ہوا تھا۔ جس میں گزشتہ عالمی جنگ کے تجربہ کار ہواباز ان کے ہاتھوں تربیت یافتہ ہواباز اور کینیڈا کے مشہور ہواباز بھی شامل ہوئے تھے۔ اور یہ حقیقت آج بھی دولت مشترکہ کے ریکارڈ میں موجود ہے (اور ہمیشہ محفوظ رہے گی) کہ پاکستانی ہواباز ہی مقابلے میں اول آئے تھے۔

جب پاک فضائیہ کو امریکی سیبر جیٹ ملے تو ان کی پرواز کی تربیت کے لئے ہمارے چند ہوابازوں کو امریکہ بھیجا گیا۔ لیکن امریکہ کے فضائی انسٹرکٹروں نے جب پاکستانی ہوابازوں کی ہنرمندی دیکھی تو وہ بے ساختہ کہہ اٹھے۔ کہ پاکستانی ہوابازوں کو یہاں بلا کر تربیت دینے کی ضرورت نہیں انہیں صرف طیارے دے دو۔ ہمارے "زیر تربیت" ہوابازوں نے وہاں بھی راکٹ اور گن فائرنگ میں انسٹرکٹروں کے منہ پھیر دیئے تھے۔

۱۹۵۸ء کے آخر میں پاکستانی فضائیہ کے ہوابازوں نے فضائی کرتب کا ایسا کمال دکھایا۔ جسے دنیا کے کسی بھی فضائیہ کے ہواباز دہرا نہیں سکے۔ کسی نے اس سے پہلے ایسی جرأت ہی نہیں کی تھی۔ یہ کرتب تھا "ڈائمنڈ فارمیشن لوپ" یعنی سولہ جیٹ طیارے چوکور ہیرے کی شکل میں اڑا کر انہیں اسی شکل میں الٹا کر کے پھر سیدھا کرنا۔ کمال یہ تھا۔ کہ بجائے اس کے کہ ہر طیارہ الگ الگ الٹا ہو کر سیدھا ہوا۔ پوری کی پوری فارمیشن اپنی ترتیب بدلے بغیر الٹی ہو کر آہستہ آہستہ سیدھی ہوئی اور آگے نکل گئی۔

انگلستان کے طیارہ سازوں کے دو مشہور جریدوں "فلائٹ" اور "ایروپلین" کے نامہ نگار جو خود منجھے ہوئے ہواباز ہیں۔ وہاں موجود تھے۔ یہ کرتب دیکھ کر ان کی آنکھیں اور منہ حیرت سے کھل گئے تھے اور انہوں نے کہا تھا۔

کہ یہ فضائی کرتب انگلستان میں دکھایا جا چکا ہے۔ لیکن سولہ طیاروں سے نہیں صرف چار طیاروں سے روسی اور امریکی نمائندوں نے بھی ایسے ہی بے ساختہ تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا۔ کہ ہمارے ہوا باز اتنی جرأت نہیں کر سکتے۔

اس "ڈائمنڈ ٹوپ" کے فضائی قائد، گروپ کیپٹن ظفر مسعود تھے۔ جنہوں نے سرگودھا کے معرکہ میں فضائی قائد گروپ کیپٹن ظفر مسعود تھے۔ جنہوں نے سرگودھا کے معرکہ میں فضائی جنگ کی قیادت اس قابلِ فخر انداز سے کی ہے۔

پلٹنا جھپٹنا جھپٹ کر پلٹنا

سکواڈرن لیڈر عالم سے اب کونسا پاکستانی واقف نہیں۔ وہ ہر برنا و پیر و جوان کی آنکھوں کا تارا ہیں۔ سنئے کہ انہوں نے تیس سیکنڈ میں پانچ طیارے کس طرح مار گرائے تھے (واضح رہے کہ ان کا یہ کارنامہ عالمی ریکارڈ کی حیثیت رکھتا ہے)۔

سکواڈرن لیڈر عالم نے جو داؤ کھیل کر تیس سیکنڈ میں پانچ طیارے مار گرائے تھے۔ وہ کھیل ہیں۔ اکثر ہوا باز یہی داؤ کھیلنا چاہتے ہیں۔ لیکن ہر کوئی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اس میں پٹ جانے کا خطرہ زیادہ ہوتا ہے عالم نے چھ بھارتی طیاروں کو اپنے پیچھے لگا لیا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ چھ کے چھ طیارے اسے نشانے میں لے چکے اور گنیں چلانے کو ہیں۔ تو اس نے پلک جھپکتے ایسی قلابازی لگائی کہ تمام دشمن طیارے اس کے اوپر سے آگے گزر گئے۔ عالم نے سیدھے ہو کر چند لمحوں میں سب کو اپنی مشین گنوں کی زد میں لے کر پانچ کو مار گرایا۔ اسے "لیڈ" دینا کہتے ہیں۔

صلۂ شہید کیا ہے؟

اور فلائٹ لفٹیننٹ یونس:—— زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا—— سنیئے۔ کہ اس نے دشمن کی قید کی حیات بے شرف پر مرگ باشرف کو ترجیح دے کر قوم کا سر کتنا اونچا کر دیا۔

پٹھانکوٹ پر حملے کے دوران ہمارے فلائٹ لفٹیننٹ یونس شہید دشمن کی گولیوں سے مجروح ہو گئے اور ان کے طیارے کو بھی نقصان پہنچا۔ آپ پیراشوٹ کے ذریعے طیارے سے نکل سکتے تھے۔ آپ نے اپنے فلائٹ کمانڈر سے کہا——

"شاید میں اپنے علاقے تک نہ پہنچ سکوں۔ یہاں اتر کر میں ہندوؤں کے ہاتھوں قید نہیں ہونا چاہتا—— مجھے اجازت دیجئے کہ جس مقصد کے لئے یہاں آیا ہوں۔ وہ پورا کر سکوں" اتنا کہنے کے بعد فلائٹ کمانڈر کے ساتھ آپ کا ائرلیس کا رابطہ ٹوٹ گیا۔ فلائٹ کمانڈر نے دیکھا کہ یونس شہید اپنے طیارے کو غوطے میں ڈال چکے تھے۔ اور طیارہ پٹھان کوٹ کے ہوائی اڈے کے ایک ہینگر (جہاں طیارے رکھے ہوتے ہیں) کی سیدھ میں جا رہا تھا۔ یونس شہید کے ساتھی ہوا بازوں نے اوپر سے دیکھا۔ کہ آپ نے طیارہ نیچے کھڑے بھارتی مگ طیاروں سے ٹکرایا۔ اور کئی طیاروں کو اپنے ڈھنگ سے چھری کی طرح کاٹتے ہوئے ساتھ والے ہینگر کے اندر کریش کیا۔ پاکستانی ہوا بازوں کا مشن کامیاب رہا۔ پٹھان کوٹ کا ہوائی اڈہ خاموش ہو گیا۔ یونس تو شہید ہو گیا۔ لیکن ملتِ پاکستانیہ کا سر بلند ہو گیا۔

اور دیکھئے ——

بھارت میں اگلے مورچوں کے لئے گولہ بارود سے بھری ہوئی ایک لمبی مال گاڑی امرتسر کی طرف چلی آرہی تھی — ہمارے صرف دو ہوابازوں نے اس گاڑی کو بھارتی مورچوں سے دور پیچھے اس طرح تباہ کردیا۔ کہ بارود نہ رہا۔ اسلحہ نہ رہا۔ مال گاڑی نہ رہی، مال گاڑی کے نیچے ریلوے لائن نہ رہی۔ اس کامیاب حملے میں (جس سے بھارت کی کمر ٹوٹ گئی تھی) ہمارا ایک ہواباز راکٹ پھینکنے یا مارنے کے لئے اس قدر نیچے چلا گیا تھا۔ کہ اپنے ہی راکٹوں، اور گاڑی میں پھٹنے گولہ بارود کی زد میں آکر شہید ہوگیا۔ لیکن جس مقصد کے لئے وہ اپنی جان پر کھیل گیا تھا۔ وہ پورا ہوگیا۔

بنیاد کی اینٹیں

فضائی جنگ میں، فضا میں اڑنے والے جانبازوں کے معرکے دیکھنے میں بھی آتے اور سننے میں بھی۔ لیکن فضائیہ کا ایک شعبہ ایسا ہے۔ جو درحقیقت بنیاد کی اینٹوں کی حیثیت رکھتا ہے لیکن بنیاد کی اینٹوں کی طرح وہ نگاہوں سے پوشیدہ بھی رہتے ہیں۔ حالانکہ عمارت کا سارا بوجھ انہیں کے سر پہ ہوتا ہے۔ اسے گراؤنڈ سٹاف کہتے ہیں۔ جن کا کام یہ ہے کہ وہ ہر طیارہ کو ہر وقت اڑنے کے قابل رکھیں۔ جنگ میں جب ایک طیارہ حملے سے واپس آتا ہے تو اسے دوبارہ پرواز کے قابل قرار دینے کے لئے اس کے ایک ایک رگ و ریشہ کا نہایت دقت نظر سے معائنہ کرنا، اور مرمت طلب عناصر کی مرمت کرنا ان کے ذمے ہوتا ہے۔ آپ سوچئے۔ کہ یہ کام کس قدر ذمہ دارانہ ہوتا ہے۔ اور اس میں وقت کا عنصر کس قدر اہمیت رکھتا ہے۔ اگر ایک طیارہ میں کہیں ذرا سا بھی نقص رہ جائے۔ تو نہ معلوم اس کا نتیجہ کس قدر تباہ کن ہو۔ اور اگر طیاروں کے نقائص رفع کرنے میں دیر لگ جائے۔ تو اسی نسبت سے حملوں کی تعداد میں کمی ہو جائے۔ بالخصوص جب ہمارے طیاروں کی تعداد دشمن کے مقابلہ میں پانچواں حصہ بھی نہیں تھی۔ سنیئے کہ ہمارے فضائیہ کے گراؤنڈ سٹاف نے کس عقابی نگاہ اور برقی رفتار سے شب و روز کام کیا۔

ہمارے گراؤنڈ سٹاف (ایرمین) کو غیر ملکی نامہ نگاروں نے خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا ہے۔ کہ پاک فضائیہ کی کامیابی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے۔ کہ زمین پر کام کرنے والے ہوابازوں نے چھیاسی (۸۶) فی صد طیاروں کو ہر لمحہ تیار رکھا ہے۔ چھیاسی فی صد کا مطلب دراصل سو فیصد ہوتا ہے۔ عام حالات میں طیاروں کی تیاری پچاس فیصد تک ہو تو اسے گراؤنڈ سٹاف کا کمال سمجھا جاتا ہے۔ لیکن جنگی حالات میں جب بعض طیارے ونگوں اور دیگر حصوں میں دشمن کی گولیوں کے سوراخ لے کے آئیں تو انہیں چند منٹوں میں اڑنے کے قابل بنا دینا ایسا کمال ہے جو صرف پاک فضائیہ کے ایرمینوں نے کر دکھایا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ دوسری عالمی جنگ میں جب میں برطانوی ہند کی ایئر فورس میں تھا۔ تو جو طیارے گولیوں سے مجروح ہو کے آتے تھے، یا جن کا وائرلیس سسٹم بگڑ جاتا تھا۔ یا جن میں کوئی اور خرابی پیدا ہو جاتی تھی۔ تو ہم دیسی لوگ ہی نہیں خود برطانوی ایرمین بھی ایسے طیاروں کی مرمت کرتے کئی کئی روز صرف کر دیا کرتے تھے۔

حملے کے بعد طیاروں میں از سر نو راکٹ لگانے پڑتے ہیں۔ مشین گنوں میں گولیوں کے نئے پٹے ڈالنے پڑتے ہیں۔ بعض مشین گنیں فائر کرتے رکتی ہیں۔ انہیں ہواباز کی رپورٹ کے مطابق ٹھیک کرنا ہوتا ہے۔ پٹرول ٹینکوں کو از سر نو بھرا جاتا ہے اور اس کے سارے ہی سسٹم کا از سر نو معائنہ کرنا ہوتا ہے۔ ان تمام کاموں میں خاصا وقت صرف ہوتا ہے۔

لیکن پاک فضائیہ کے گراؤنڈ سٹاف یہ کام منٹوں میں کر کے طیاروں کو پھر سے فضا میں بھیج دیتے رہتے۔ زمین پر کام کرنے والوں کو جس قدر خراج تحسین پیش کیا جائے کم ہے۔

ٹھیک کہا ہے کہ انہیں جس قدر خراج تحسین بھی ادا کیا جائے کم ہے۔

پاکستانی فضائیہ کے شاہین بچو! قوم کو تم پر ناز ہے۔ اللہ تمہیں ہر وقت اور ہر مقام پر اپنی حفاظت میں رکھے۔ اور زندگی کے ہر بلند مقصد میں کامیابی و کامرانی عطا کرے۔

گرچہ اس دیر کہن کا ہے یہ دستور حیات! ۔۔۔ کہ نہیں میکدہ و ساقی و مینا کو ثبات!
قسمت بادہ مگر حق ہے اسی ملت کا! ۔۔۔ انگبیں جس کے جوانوں کو ہے تلخابِ حیات!

زندہ باد! شاہین بچگانِ پاکستان زندہ باد!

عقابی شان سے جھپٹے تھے جو بے بال و پر نکلے ۔۔۔ ستارے شام کے خونِ شفق میں ڈوب کر نکلے
ہوئے مدفونِ دریا زیرِ دریا تیرنے والے ۔۔۔ طمانچے موج کے کھاتے تھے جو بن کر گہر نکلے
غبارِ رہ گذر ہیں کیمیا پر ناز تھا جن کو ۔۔۔ جبینیں خاک پر رکھتے تھے جو اکسیر گر نکلے
ہمارا نرم رو قاصد پیامِ زندگی لایا ۔۔۔ خبر دیتی تھیں جن کو بجلیاں وہ بے خبر نکلے
زمیں سے نوریانِ آسماں پرواز کہتے تھے ۔۔۔ یہ خاکی زندہ تر پائندہ تر تابندہ تر نکلے
جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں ۔۔۔ ادھر ڈوبے ادھر نکلے۔ ادھر ڈوبے ادھر نکلے

یقیں افراد کا سرمایۂ تعمیرِ ملت ہے
یہی قوت ہے جو صورت گرِ تقدیرِ ملت ہے

اقبالؒ

قائدِ اعظمؒ کے یومِ پیدائش کی یاد میں

ایک چراغ اور لاکھ اندھیرے

[طلوعِ اسلام کی طرف سے ایک تقریب قائداعظمؒ کے یوم پیدائش کے موقعہ پر بھی منائی جایا کرتی ہے۔ ۲۵ دسمبر ۱۹۶۵ء کو اسی سلسلہ میں وائی۔ ایم۔ سی۔ اے ہال لاہور میں ایک جلسہ منعقد ہوا جس سے حسبِ معمول پرویز صاحب نے خطاب کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ملتِ پاکستانیہ جنگ ستمبر ۱۹۶۵ء کے طوفان سے بنا کر نکلی تھی۔ اس لئے پرویز صاحب کی اس تقریر میں تقسیم ہند سے پہلے تحریکِ پاکستان کی مخالفت اور تشکیلِ پاکستان کے بعد اس مملکت کی تخریب کے سلسلہ میں معاندین کی اُن مذموم کوششوں کا ذکر کیا گیا تھا جو جنگ ستمبر پر منتج ہوئی تھیں۔ اس سال ماہ دسمبر میں پاکستان پھر اسی قسم کی پرخطر گھٹاؤں میں گھرا ہوا ہے۔ اس نہج سے ہم پرویز صاحب کی محولہ بالا تقریر کو ایک بار پھر قوم کے سامنے لاتے ہیں تاکہ یہ حقیقت اجاگر ہو جائے کہ جو کچھ پاکستان کے خلاف اس وقت ہو رہا ہے وہ کوئی نئی بات نہیں۔ اس تقریر کو پڑھتے وقت آپ ۱۹۶۵ء کے حالات کو پیشِ نظر رکھیے۔ خدا کرے کہ جب یہ سطور قارئین کے سامنے آئیں، ہم اس خطرہ سے محفوظ ہو چکے ہوں۔ (طلوعِ اسلام)]

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

صدرِ محترم! میری عزیز بہنو اور بھائیو!! سلام و رحمت۔

قرآن کریم نے ایک جگہ کہا ہے کہ عَسٰۤى اَنۡ تَكۡرَهُوۡا شَيۡـئًا وَّهُوَ خَيۡرٌ لَّـكُمۡ (۲/۲۱۶) ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تم پر ناگوار گزرے لیکن اس میں تمہارے لئے خیر کے پہلو مضمر ہوں۔ قرآن کریم نے یہ بات جنگ کے سلسلہ میں کہی تھی۔ اور یہ عجیب توافق ہے کہ اس کی محسوس تفسیر بھی ہمارے سامنے حالیہ جنگ کے وقت آئی۔ ہماری نئی نسل کے جو بچے تقسیم کے بعد پیدا ہوئے یا جن کے شعور نے پاکستان میں آکر آنکھ کھولی وہ بار بار اعتراض کیا کرتے تھے کہ مسلمانوں نے پاکستان کیوں بنا لیا۔ یہ ہندوستان سے الگ کیوں ہو گئے۔ وہ اتنا وسیع و عریض ملک تھا، اس کے وسائل کثیر تھے۔ دنیا کے بڑے بڑے ممالک اس ملک کے ساتھ خوشگوار تعلقات رکھنے پر مجبور تھے۔ اگر ہم ان کے ساتھ رہتے تو ہمیں یہ آئے دن کی مصیبتیں کیوں جھیلنی پڑتیں، یہ تکلیفیں کیوں اٹھانی پڑتیں۔ یہ دشواریاں کیوں پیش آتیں۔ ہم نے ان سے الگ ہو کر خواہ مخواہ اپنے لئے پریشانیاں پیدا کر لیں۔ مفت میں ایسا تکلیف دہ دردِ سر خرید لیا۔ اگر ہم ان کے ساتھ رہتے تو نہ پانیوں کا سوال پیدا ہوتا اور نہ کشمیر کا مسئلہ ہمارے لئے سوہانِ روح

نوجوانوں کے اعتراضات

ہوتا، وغیرہ وغیرہ۔ یہ نوجوان اگر میرے پاس آتے۔ میں پہلے انہیں یہ سمجھانے کی کوشش کرتا کہ آزاد مملکت کا وجود ہمارے دین کا تقاضا اور ایمان کا مطالبہ تھا۔ ہم غیروں کی محکومی میں اسلامی زندگی بسر کر ہی نہیں سکتے۔ اسلام ایک نظامِ حیات، ایک ضابطۂ زندگی ہے جو اپنے متشکل ہونے کے لئے ایک آزاد خطۂ زمین چاہتا ہے۔ یہی تھی ہمارے مطالبۂ پاکستان کی بنیاد۔ لیکن اسلام کے متعلق جو کچھ وہ مسجدوں اور وعظوں میں سنتے، حتیٰ کہ جو کچھ انہیں اسلامیات کے نام سے پڑھایا جاتا، اس کی روشنی میں میری بات ان کی سمجھ میں نہ آتی ـــــ یہ بات ہمارے ہاں کے بڑے بڑے مدبروں کی سمجھ میں نہیں آتی۔ ان بچوں کی سمجھ میں نہ آتی تو اس کا کیا گلہ۔ گلہ تو اس بات کا ہے کہ انہیں پاکستان میں بھی صحیح اسلام سے روشناس نہیں کرایا گیا۔ اگر ان کی تعلیم کی عمارت صحیح بنیادوں پر اٹھتی تو پھر یہ سمجھ سکتے کہ دین اور مذہب میں فرق کیا ہوتا ہے۔ مذہب ہر فضا میں پنپ سکتا ہے بلکہ محکومی اور بے چارگی میں وہ اور گہرا اور شدید ہو جاتا ہے۔ اور دین آزاد مملکت کے سوا کہیں سانس نہیں لے سکتا۔

یہاں سے نیچے اتر کر جب ان نوجوانوں کو یہ سمجھانے کی کوشش کی جاتی کہ ہندو ایسی قوم ہے ہی نہیں جس کے ساتھ کوئی شریف آدمی زندگی بسر کر سکے تو یہ بات پھر ان کی سمجھ میں نہ آتی۔ یہ اس لئے کہ انہوں نے ہندو کو دیکھا ہی نہیں تھا۔ ان کا

ہندو کیا ہے

اس کے ساتھ کبھی سابقہ نہیں پڑا تھا۔ ہمارے یہ نوجوان کہتے تھے کہ دنیا میں اور ملک بھی ہیں جن میں مختلف مذاہب اور مختلف نسلوں کے لوگ ایک جگہ آرام سے رہتے بستے ہیں۔ ہم ہندوؤں کے ساتھ اسی طرح کیوں نہیں رہ سکتے تھے۔ اس جنگ میں ہندو جب بے نقاب ہو کر سامنے آیا تو ہمارے ان نوجوانوں نے پہلی مرتبہ اسے اس کے اصلی خدوخال میں دیکھا اور اس کے بعد محمود و نجو وغیرہ کچھ بھی سمجھانے کے پکار اٹھے کہ آپ سچ کہتے تھے۔ اس قسم کے انسانوں کے ساتھ واقعی کوئی شریف آدمی نہیں رہ سکتا۔ غالبؔ کے الفاظ میں ؎

فغانِ من دلِ خلق آب کرد ورنہ ہنوز
نگفتہ ام کہ مرا کار با فلاں افتاد

حقیقت یہ ہے کہ قائد اعظمؒ کی صحیح عظمت بھی اسی وقت سامنے آتی ہے جب یہ معلوم ہو جائے کہ ان کا واسطہ کس قسم کے لوگوں سے پڑا تھا، اور کس کس ذہنیت کے دشمنوں سے جنگ کر کے انہوں نے پاکستان حاصل کیا تھا ـــــ ان مخالفوں میں ایک طرف ہندو تھا جو اپنی ہزار سالہ غلامی کا انتقام، مسلمانوں کو اپنا محکوم رکھ کر لینا چاہتا تھا۔ اس کے ساتھ دوسری طرف انگریز تھا جس کے سینے میں صلیبی جنگوں کے زخم ابھی تک مندمل نہیں ہوئے ـــــ یا یوں کہئے کہ اس نے انہیں ابھی تک مندمل نہیں ہونے دیا۔ اور وہ اس موقعہ کی تلاش میں رہتا ہے کہ مسلمانوں کو کس طرح نقصان پہنچایا جائے۔ ان دونوں مخالفوں کا متحدہ محاذ ہی کچھ کم جرأت آزما اور حوصلہ فرسا نہ تھا جو ان کے ساتھ خود مسلمانوں کی کئی ایک جماعتیں بھی "شریکِ جہاد" ہو گئیں۔ نیشنلسٹ مسلمان، جمیعت العلماء، مجلس احرار، سرخپوش، انصار، جماعت اسلامی، سب تحریک پاکستان کی مخالفوں کے صفوں میں شامل تھے۔ اور ان سب کا مقابلہ اسلام کا یہ سپاہی (قائد اعظمؒ) تنہا کر رہا تھا۔

حالیہ جنگ کی علت

ہندوستان اور پاکستان میں جو حالیہ جنگ ہوئی ہے اس کی علت مسئلہ کشمیر کو قرار دیا جاتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس مسئلہ کو ہندوستان اور پاکستان کی

نزاع میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ لیکن یہ بھی علاماتِ مرض میں سے ایک علامت ہی ہے۔ علتِ مرض کچھ اور ہے۔ قرآن کریم نے اسلام کے دشمنوں کے متعلق کہا ہے۔ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ۔ وَمَا تُخْفِیْ صُدُوْرُهُمْ اَکْبَرُ ۔ (۳/۱۱۷) اسلام دشمنی کی کچھ باتیں بعض اوقات ان کی زبان سے (بے اختیار) نکل جاتی ہیں۔ ورنہ جو کچھ ان کے دلوں میں چھپا ہے، وہ ان سے کہیں زیادہ شدید ہے۔ اسی قسم کی ایک بات اگلے دنوں، ہندوستان کے وزیرِ دفاع مسٹر جگجیون رام کی زبان سے بھی بے اختیار نکل گئی۔ اسے غور سے سنیئے۔ انہوں نے ایک بیان میں کہا ہے کہ

> پاکستان اور ہندوستان کے درمیان اسی دن سے مخاصمت کی بنیاد رکھ دی گئی تھی جس دن پاکستان معرضِ وجود میں آیا تھا۔ بھارت اور پاکستان کے درمیان آئیڈیالوجی کا اختلاف ہے اس کے سوا کوئی اختلاف نہیں۔ اور یہ اختلاف اور دشمنی ہفتے یا مہینے بھر کی نہیں بلکہ سالہا سال تک رہے گی۔ بھارت کو اس لئے ایک لمبی اور فیصلہ کن جنگ کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔

اس سلسلے میں مسٹر مہاجن نے اگلے دنوں اس حقیقت کا انکشاف کیا تھا کہ دسمبر ۱۹۴۷ء میں بھارت کے نیتاؤں (سربراہوں) کی ایک خفیہ مجلس میں یہ تجویز زیرِ غور آئی تھی کہ پاکستان پر فوراً حملہ کر دیا جائے۔ مسٹر مہاجن کو افسوس تھا کہ اس تجویز پر اُس وقت عمل نہ کیا گیا، اور پاکستان کو موقعہ دے دیا گیا کہ وہ اپنی مدافعت کی تیاریاں کر لے۔ ورنہ معاملہ اُسی وقت صاف ہو جاتا۔

یہ تھے برادرانِ عزیز! ان قوموں کے عزائم اور یہ ہے اس جنگ کی بنیادی وجہ۔ یعنی یہ کوئی ہنگامی اختلاف یا عارضی نزاع نہیں، یہ وہی کفر و اسلام کی نزاع ہے جو پہلے دن سے چلی آ رہی ہے۔ یہ وہی حق و باطل کی کشمکش ہے جو ازل سے تا امروز مسلسل جاری ہے اور جاری رہے گی۔

> نہ ستیزہ گاہِ جہاں نئی، نہ حریفِ پنجہ فگن نئے
> وہی فطرتِ اسد اللہی، وہی مرحبی وہی عنتری

ہندی جمہوریت

انگریز ہندوستان سے جا رہا تھا۔ ہندو کا مطالبہ یہ تھا کہ ملک کا اقتدار "اہلِ ملک" کے سپرد کر دیا جائے تاکہ وہ وہاں جمہوری انداز کی حکومت قائم کر سکیں۔ سطحی طور پر آپ دیکھیں گے تو یہ مطالبہ بڑا معقول اور یہ روش بڑی انصاف پسندانہ نظر آئے گی۔ لیکن اگر آپ سطح سے ذرا نیچے اتر کر دیکھیں گے تو آپکو نظر آئے گا کہ جمہوریت کے اس معصوم سے جال میں کس قدر مسلم شکار لڑیاں پیوست تھیں۔ دنیا میں جہاں جہاں نظامِ جمہوریت رائج ہے وہاں بالعموم کیفیت یہ ہے کہ سارے ملک میں ایک قوم بستی ہے۔ اس قوم میں مختلف سیاسی پارٹیاں ہوتی ہیں۔ الیکشن میں ایک پارٹی کثرت حاصل کر لیتی ہے اور زمامِ اقتدار اس کے ہاتھ میں آ جاتی ہے۔ جو پارٹی اقلیت میں رہ جاتی ہے وہ کوشش کرتی ہے کہ مخالف پارٹی کے کچھ ممبروں کو توڑ کر اپنے ساتھ ملا لے۔ اور یوں اپنی اقلیت کو اکثریت میں بدل کر اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لے۔ اگر وہ اس طرح کامیاب نہ ہو تو وہ آئندہ الیکشن تک کا انتظار کرتی ہے تاکہ اس وقت اکثریت حاصل کر لے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس انداز کی حکومت میں کوئی پارٹی مستقل طور پر برسرِ اقتدار اور دوسری پارٹی ابدی طور پر محکوم نہیں رہتی۔ اس میں ادل بدل اور اتار چڑھاؤ ہوتا رہتا ہے۔ لیکن ہندوستان میں صورتِ حالات اس سے یکسر مختلف تھی۔ اس میں ہندو اکثریت میں تھے اور مسلمان اقلیت میں۔ اور

ان کی اقلیت کبھی اکثریت میں تبدیل نہیں ہو سکتی تھی (تاوقتیکہ یہ وہاں کے دس پندرہ کروڑ ہندوؤں کو مسلمان نہ کر لیں، جو ناممکن تھا) لہٰذا ہندوستان کی جمہوری حکومت درحقیقت ہندوؤں کی مستقل حکومت اور مسلمانوں کی ابدی محکومی کے مترادف تھی۔ اس سلسلہ میں ہندوؤں کے عزائم کیا تھے، اس کا انکشاف قائداعظمؒ نے (آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے اجلاس منعقدہ دسمبر ۱۹۴۰ء میں) ان الفاظ میں فرمایا تھا۔

ہندوؤں کے عزائم

ساورکر (صدر ہندو مہاسبھا) کی اسکیم یہ ہے کہ جب (انگریز کے چلے جانے کے بعد) سیلانی، بحری اور فضائی فوج اور نظم و نسق میں ہندوؤں کو ۸۵ فیصد حصہ مل جائیگا تو پھر ہندو راج قائم کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ ان مسلمانوں کا کیا حشر ہوگا جو شمال مغرب اور شمال مشرق میں بستے ہیں، سنیئے۔ وہ (مسٹر ساورکر) کہتے ہیں کہ صوبجات پر ہندو فوج اس طرح بٹھا دی جائے گی جس طرح اب برطانوی فوج متعین ہے۔ اور یہ فوج اس کا خیال رکھے گی کہ مسلمان سر نہ اٹھا سکیں۔

آپ نے اندازہ لگا لیا۔ عزیزانِ من! کہ جمہوری اندازِ حکومت کے ماتحت، ہندوؤں کے عزائم کیا تھے؟ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ہندوؤں کی متشدد مذہبی جماعت تھی۔ ان کا نیشنلسٹ طبقہ جو کانگرس سے متعلق تھا، وہ ایسا نہیں چاہتا تھا۔ ان کے پیشِ نظر سیکولر سٹیٹ کا تصور تھا جس پر کسی خاص گروہ کے مذہبی تصورات کا دوسرے گروہ پر اثر نہیں پڑ سکتا۔ لیکن ایسا کہنے والوں کو اس کا علم نہیں کہ وہاں خود کانگرس کے کیا عزائم تھے۔ اگست ۱۹۳۹ء کا

کانگرس کے عزائم

ذکر ہے، کانگرس کے جنرل سیکرٹری، اچاریہ کرپلانی نے ایک طویل بیان شائع کیا تھا جس میں اس امر کی وضاحت کی گئی تھی کہ کانگرس کے سامنے صرف ملک کے سیاسی مقاصد نہیں، وہ ملک کی معاشرتی زندگی کو بھی گاندھی جی کے فلسفۂ حیات کے مطابق ازسرِ نو متشکل کرنا چاہتی ہے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے لکھا تھا:

> گاندھی جی نے کانگریس کو بتایا کہ ہمارا کام صرف یہ نہیں کہ ملک کی سیاسی باگ ڈور انگریز کے ہاتھ سے چھین کر اہلِ ملک کے ہاتھ میں دے دیں بلکہ سب سے ضروری چیز یہ ہے کہ ہم اپنی تمام جدوجہد کی بنیاد کسی ایسے فلسفۂ حیات پر رکھیں جس کے دائرے میں ہماری معاشرت، اخلاق اور روحانیت سب کچھ داخل ہو۔ بالفاظِ دیگر ہماری تحریک کو صرف سیاسی نہیں ہونا چاہیئے بلکہ اسے روحانی اور اعلیٰ فلسفۂ زندگی کے ماتحت ہونا چاہیئے تاکہ اس جدوجہد سے نہ صرف ہماری سیاسی زندگی متاثر ہو بلکہ ہماری زندگی کا ہر شعبہ اس سے اثر پذیر ہو اور ہماری زندگی کا ایک نیا باب شروع ہو جسے ہم تاریخ کا نیا دور کہہ سکیں۔ زندگی کا یہی وہ نیا باب اور نیا دور ہے جسے گاندھی جی کانگرس کے ذریعے ہندوستان میں لانا چاہتے ہیں۔

یہ تھے برادرانِ عزیز! اس کانگرس کے عزائم جسے یکسر سیکولر پارٹی سمجھا جاتا ہے — یہ گاندھی جی جن کے فلسفۂ حیات کو ملک کی نئی معاشرتی زندگی کا سنگِ بنیاد بنانا مقصود تھا، خود کیا تھے، اس کے متعلق انہی کی زبان سے سنیئے — انہوں نے اپنے اخبار ینگ انڈیا کی ۱۲ اکتوبر ۱۹۲۱ء کی اشاعت میں لکھا تھا۔

میں اپنے آپ کو سناتنی ہندو کہتا ہوں کیونکہ میں ویدوں، اپنشدوں، پرانوں اور ہندوؤں کی تمام مذہبی کتابوں کو مانتا ہوں۔ اوتاروں کا قائل ہوں اور تناسخ پر عقیدہ رکھتا ہوں میں گورکشا کو اپنے دھرم کا جزو سمجھتا ہوں اور بت پرستی سے انکار نہیں کرتا میرے جسم کا رواں رواں ہندو ہے۔

(۰)

منافقت

جنگ کے دوران آپ نے ہندوستان کے وزیر اعظم مسٹر شاستری کی قلابازیوں کا تماشا دیکھا ہوگا۔ جو کچھ صبح کے وقت کہا اس کی تردید دوپہر کو کر دی۔ جو کچھ دوپہر کو کہا، اس سے شام کو مکر گئے۔ الفاظ ہمیشہ ذو معنی استعمال کئے۔ آج ان کا مطلب کچھ لیا، کل کچھ اور۔ دھوکا، فریب، غلط بیانیاں، یہ ان کا معمول تھا۔ جو کچھ خود کیا یا کرنا چاہا، پہلے اس کا الزام پاکستان کے سر دھر دیا۔ جانا کسی اور طرف کو ہوا، رُخ کسی اور طرف کا کیا۔ بتایا کچھ اور، کیا کچھ اور۔ یہ ہے ان کی سیاست۔ لیکن یہ روش مسٹر شاستری کی طبع زاد نہیں۔ اسے بھی انہوں نے اپنے بزرگوں سے ورثہ میں پایا ہے: مہاتما" گاندھی بھی یہی کچھ کیا کرتے تھے۔ ان کے متعلق قائد اعظمؒ نے (مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن جالندھر کے اجلاس ۱۹۴۵ء میں) کہا تھا۔

ان کا (گاندھی جی کا) مقصد وہ نہیں ہوتا جو وہ زبان سے کہتے ہیں اور جو ان کا مقصد ہوتا ہے وہ کہتے نہیں۔

اسی طرح، انہوں نے اگست ۱۹۴۵ء میں ایک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہمیں جس حریف سے پالا پڑا ہے وہ گرگٹ کی طرح اپنا رنگ بدلتا رہتا ہے۔

جب ان کے (مسٹر گاندھی کے) مفید مطلب ہوتا ہے تو وہ کہہ دیتے ہیں کہ وہ کسی کے نمائندہ نہیں وہ محض انفرادی حیثیت سے گفتگو کر رہے ہیں۔ وہ کانگرس کے چار آنہ کے ممبر بھی نہیں رہتے اور جب ضرورت ہوتی ہے تو سارے ہندوستان کے واحد نمائندہ بن جاتے ہیں۔ جب اور حربوں سے کام نہیں چلتا، تو مرن برت رکھ لیتے ہیں جب کوئی دلیل پاس نہیں ہوتی تو "اندرونی آواز" کو بدل لیتے ہیں۔ کہتے کہ ایسے شخص سے ہم کس طرح بات کر سکتے ہیں۔ وہ تو ایک چیستان ہیں، ایک معمہ ہیں۔

ان کی دورخی کا عالم یہ تھا کہ جنگ عظیم کے دوران جب انگلستان پر دن رات بمباری ہو رہی تھی اور جاپانی کلکتہ تک بڑھ آئے تھے، وہ وائسرائے کے ہاں گئے اور کہا کہ جب میں لندن پر بمباری کی خبریں پڑھتا ہوں اور وہاں کے جوانوں، بوڑھوں، بچوں، عورتوں پر جو کچھ گزرتی ہے اسے سنتا ہوں تو میری روح کانپ اٹھتی ہے۔ مجھے راتوں کو نیند نہیں آتی۔ ایسے نازک حالات میں، میں انگریزوں کے لئے ہندوستان میں کسی پریشانی کا موجب نہیں بننا چاہتا۔ میں تمام اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر جنگ کے سلسلہ میں بلا مشروط تعاون کا یقین دلاتا ہوں۔ یہ کہتے کہتے ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ وائسرائے بہت متاثر ہوئے۔ ان کی ہمدردی اور تعاون کا شکریہ ادا کیا۔

گاندھی جی نے اُدھر یہ کیا اور اِدھر کانگریس کی جلس عاملہ سے ریزولیوشن پاس کرا دیا کہ اگر حکومت ملک کے اختیارات کانگرس کیطرف منتقل کرنے کا وعدہ نہیں کرتی۔ تو ہم ملک کی اینٹ سے اینٹ بجا کر رکھ دینگے۔ یہاں کے نظم و نسق کو

تہ و بالا کر دینگے۔ انگریزوں کو یہاں سے نکال کر دم لینگے۔

اور جب وائسرائے نے گاندھی جی سے پوچھا کہ یہ کیا ؟ تو انہوں نے نہایت معصومانہ انداز میں کہہ دیا کہ میرا کانگریس پر کیا بس ہے۔ میں تو اس کا چار آنہ کا ممبر بھی نہیں ہوں۔

آپ سوچئے برادرانِ عزیز ! کہ جس قوم کے "مہاتماؤں" کا یہ عالم ہو اس کے "مسٹروں" کی کیا کیفیت ہوگی !

جوڑیاں کی مسجد

اس سلسلہ میں مجھے حال ہی کی ایک دلچسپ بات یاد آگئی۔ آپ کو یاد ہوگا کہ جوڑیاں کے معرکہ کے ضمن میں آل انڈیا ریڈیو نے یہ خبر نشر کی تھی کہ پاکستانی بمباروں نے صبح کے آٹھ بجے جوڑیاں کی مسجد پر بم گرائے اور پچاس نمازیوں کو شہید کر دیا۔ اور اس کے بعد واویلا مچایا تھا کہ ان لوگوں کو دیکھو! یہ اپنی پرستش گاہوں کو تباہ کرنے سے بھی باز نہیں آتے۔ اول تو آپ دیکھئے کہ صبح کے آٹھ بجے کونسی نماز ہوتی ہے جس میں پچاس نمازی شہید ہو گئے۔ پھر اس پر بھی غور کیجئے کہ میں برسوں جوڑیاں کی مسجد میں رہا۔ وہ اتنی چھوٹی ہے کہ اس میں پچاس آدمی بیک وقت بمشکل کھڑے ہو سکتے ہیں۔ وہاں ہمیں بتایا گیا کہ جب جوڑیاں پر پاکستانیوں نے قبضہ کیا ہے تو یہ مسجد نہایت خستہ اور خراب حالت میں تھی اور اس میں ایک موچی بیٹھتا تھا۔ اسے مسجد کی شکل دوبارہ ہماری فوج کے سپاہیوں نے دی ہے۔

اور آگے بڑھیئے۔ اس مسجد پر (افسانوی) بمباری کی خبر نشر کر کے، بھارتیوں نے یہ تأثر بھی پیدا کرنا چاہا کہ انہیں دوسرے مذاہب کی پرستش گاہوں کا بڑا احترام ہے۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ اس وقت

ہندوستان کی مساجد

ہندوستان میں مسلمانوں کی مساجد کی حالت کیا ہے۔ یہ میرے سامنے ہندوستان کے اخبار مدینہ کی ۲۸ جولائی ۱۹۶۵ء کا پرچہ ہے۔ اس میں لدھیانہ سے شائع ہونے والے (ہندوؤں کے ایک اخبار) ترجمان کے حوالے سے ایک دلچسپ خبر درج ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ ایک مسجد پر ہندوؤں کا قبضہ تھا۔ اس کے ایک کمرہ پر ایک سکھ نے قبضہ جما لیا۔ ہندوؤں نے اسے بیدخل کرنا چاہا تو اس نے "مسلم اوقاف بورڈ سے کہہ کر" ہندوؤں کے خلاف مقدمہ دائر کرا دیا۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے اخبار ترجمان نے کہا ہے کہ اس سکھ سردار کو ایسا کرتے وقت ذرا خیال نہ آیا۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ

اس شہر کی ۱۱۷ پرانی مسجدوں میں سے ۹۰ میں گوردوارے قائم ہیں اور صرف ۱۵، ۱۶ میں مندر۔ باقیوں میں رہائش ہے۔

یہ ہے برادرانِ عزیز! ہندوستان کی سیکولر اسٹیٹ میں مسلمانوں کی مساجد کی حالت۔ اُس سیکولر اسٹیٹ میں جس کے نمائندوں کو جوڑیاں کی مسجد کی "تباہی" سے اس قدر صدمہ ہوا ہے۔

(۰)

برطانیہ اور پاکستان

یہ تو تھا ہندو — اب اس محاذ کے دوسرے فریق "انگریز" کو لیجئے۔ تحریکِ پاکستان کے دوران ہندوؤں نے بڑی شد و مد سے یہ پراپیگنڈہ کر رکھا تھا کہ تقسیمِ ہند کی اسکیم انگریز کی پیدا کردہ ہے اور جناحؒ، انگریز کے اشارے پر تشکیلِ پاکستان کی تحریک چلا رہا ہے — ہندو تو ایک طرف خود پاکستان میں ابھی تک ایسے لوگ موجود ہیں جو اس خیال کو عام کرنے میں مصروف رہتے ہیں کہ پاکستان کا تصور برطانیہ

کی پیدا کردہ سازش تھی اور قائداعظمؒ انگریز کا آلۂ کار تھا۔ لیکن سنیئے کہ تحریک پاکستان کے دوران انگریز مسلمانوں کے خلاف کیا کچھ کر رہا تھا اور اس محاذ میں ہندو اور انگریز دونوں کس طرح مسلمانوں کے خلاف شانہ بشانہ لڑ رہے تھے۔ انگریز مسلمانوں کے خلاف کیا کرنا چاہتا تھا، اس کے متعلق قائداعظمؒ نے سندھ مسلم لیگ کی سالانہ کانفرنس میں اکتوبر ۱۹۳۸ء میں کہا تھا کہ

> برطانیہ ہندوستان کے مسلمانوں کو بھیڑیوں کے حوالے کرنا چاہتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ برطانیہ یہ بازی لے جا سکتا ہے جس میں قوت ہو۔ لیکن ہم ہندو اور برطانیہ دونوں سے لڑینگے۔

پھر انہوں نے فروری ۱۹۴۰ء میں لیگ کونسل کے اجلاس میں کہا تھا۔

> برطانیہ عظمیٰ ہندوستان پر حکومت کرنا چاہتا ہے۔ مسٹر گاندھی اور کانگرس مسلمانوں پر حکومت کرنا چاہتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ ہم نہ برطانیہ کو مسلمانوں پر حکومت کرنے دینگے نہ ہندو کو۔ ہم آزاد رہنا چاہتے ہیں۔

مارچ ۱۹۴۱ء میں مرکزی اسمبلی میں ایک ایسا بل پیش ہوا جس سے مسلمانوں کے حقوق کی پامالی ہوتی تھی۔ اس بل پر تقریر کرتے ہوئے قائداعظمؒ نے کہا۔

> میں انگریز اور ہندو دونوں کو متنبہ کر دینا چاہتا ہوں کہ تم الگ الگ یا دونوں متفق ہو کر بھی ہماری روح کو فنا کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکو گے۔ نہ تم اس تہذیب کو مٹا سکو گے جو ہمیں ورثہ میں ملی ہے۔ ہمارا نورِ ایمان زندہ ہے۔ زندہ رہا ہے اور زندہ رہیگا۔ تم ہم پر ظلم و ستم کرو۔ ہمارے ساتھ بدترین سلوک کرو۔ ہم ایک فیصلہ پر پہنچ چکے ہیں اور ہم نے یہ عزم کر لیا ہے کہ ہم لڑتے لڑتے مر جائینگے۔

انہوں نے ۱۹۴۲ء میں یوم پاکستان کی تقریب پر تقریر کرتے ہوئے کہا تھا۔

> اگر ہندو قیادت یا برطانوی قیادت، الگ الگ یا دونوں متحد ہو کر ہمارے خلاف فریب کاریوں اور سازشوں پر اتر آئیں تو ہم اس کی مدافعت کرینگے تا آنکہ ہم ایک ایک کر کے کٹ کر مر جائیں۔

انہوں نے ۱۹۴۵ء میں پشاور کے ایک جلسہ عام میں فرمایا۔

> ہمارا کوئی دوست نہیں۔ ہمیں نہ انگریز پر بھروسہ ہے نہ ہندو پر۔ ہم دونوں کے خلاف جنگ جاری رکھیں گے۔ خواہ وہ آپس میں متحد بھی کیوں نہ ہو جائیں۔

متحدہ سازش

اس زمانے میں چین میں جنرل چیانگ کائی شک برسر اقتدار تھے جن کے پنڈت جواہر لال نہرو سے بڑے گہرے مراسم تھے اور دوسری طرف ان کا امریکہ پر بھی بڑا اثر تھا۔ ان سب کی تجویز یہ تھی کہ ہندوستان کے مسئلہ کو کسی طرح اقوام متحدہ میں لے جایا جائے۔ اس پر قائداعظمؒ نے نومبر ۱۹۴۱ء میں علیگڑھ یونیورسٹی میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا۔

> چین اور امریکہ کی متحدہ قوت بھی ہم پر کوئی ایسا دستور مسلط نہیں کر سکتی جس میں مسلمانوں کو قربان کر دیا گیا ہو۔ اگر متحدہ اقوام کسی ایسی مجنونانہ حرکت کا ارتکاب کر بیٹھی تو اسے معلوم ہو جانا چاہیئے کہ اپنی حفاظت کے لئے ایک چیونٹی بھی پلٹ کر حملہ کر دیا کرتی ہے۔ ان غیر ملکی سنگینوں کی

پرواہ نہ کرتے ہوئے جن کے سامنے میں کانگرس راج رچایا جا رہا ہوگا، ہم ملک کے سارے نظام میں زلزلہ ڈال دینگے اور اسے معطل کر کے رکھ دینگے۔

کیبنٹ مشن

۱۹۴۶ء میں کیبنٹ مشن ہندوستان آیا حکومت برطانیہ نے اعلان کیا کہ جو پارٹی اس مشن کی تجاویز کو قبول کر لیگی اسے تشکیل حکومت کا موقعہ دیا جائیگا۔ کانگرس نے اس مشن کی تجاویز کو نہ قبول کیا نہ مسترد۔ لیکن مسلم لیگ نے انہیں قبول کر لیا۔ اور آپ یہ سنکر حیران ہونگے کہ حکومت برطانیہ اپنے وعدے سے صاف مکر گئی اور لیگ کو تشکیل حکومت کا موقعہ نہ دیا۔ اس پر قائداعظمؒ نے (مسلم لیگ کونسل کے اجلاس لکھنؤ میں) کہا۔

> ہم بحث و تمحیص کرتے تھک گئے ہیں کسی سے مدد مانگنا بے سود ہے۔ دنیا میں کوئی بھی عدالت نہیں جس سے ہم داد خواہی کر سکیں۔ ہماری آخری عدالت ملت اسلامیہ ہے اور ہم اسی کے فیصلے کی پابندی کریں گے۔

پھر انہوں نے جولائی ۱۹۴۶ء میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔

> ہم جانتے ہیں کہ برطانیہ کے پاس مشین گنیں ہیں۔ وہ اپنی طاقت کو جس طرح چاہیں استعمال کریں۔ دنیا کی کوئی عدالت نہیں جس کے پاس ہم اس کے خلاف اپیل کر سکیں گے۔ دوسری پارٹی کانگریس ہے۔ وہ پوری طرح دوسری قسم کے ہتھیاروں کو استعمال کریگی۔ اس لئے اب ہم اپنے حفظ و بقا کے لئے آئینی طریقوں کو خدا حافظ کہنے پر مجبور ہیں اور اب ہم نے طے کر لیا ہے کہ براہ راست اقدام کی تیاریاں اور عمل ہماری پالیسی اور پروگرام کا جزو ہوگا۔

اور اگست ۱۹۴۶ء میں بتقریب عید قوم سے کہا کہ:

> مسلم ہندوستان کو برطانیہ کی بدعہدیوں اور وعدہ خلافیوں نے ورطۂ حیرت میں ڈال دیا ہے۔ ہم نے اگست ۱۹۴۰ء کے اعلان کے مطابق ان سے یہ وعدہ لے لیا تھا کہ جب تک ہندوستان کی بڑی سیاسی جماعتوں اور قومی زندگی کے دوسرے اہم عناصر میں کوئی سمجھوتہ نہ ہو جائے حکومت کے اختیارات کسی ایک پارٹی کے ہاتھ منتقل نہیں کئے جائینگے۔ اس اعلان میں یہ بھی تحریر ہے کہ جب تک ہندو مسلم سمجھوتہ نہ ہوگا، ہندوستان کے لئے کوئی نیا آئین متشکل نہیں ہوگا۔ لیکن آج حکومت برطانیہ نے اس صاف اور واضح اعلان کے پرزے پرزے کر دیئے ہیں۔

یہ تھا برادران گرامی قدر! برطانیہ کا رویہ ہمارے ساتھ اور قائداعظمؒ کو ہندو اور انگریز دونوں سے برسرپیکار ہونا پڑا تھا۔

قتل و غارت گری

جب ہندوؤں نے دیکھا کہ وہ مسلمانوں سے آئینی بازی نہیں لے جا سکتے تو وہ ان حربوں پر اتر آئے جو اس قسم کے دشمن کی فنایت کا آخری مظاہرہ ہوتا ہے۔ انہوں نے ان صوبوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں تھے فسادات برپا کرنے شروع کر دیئے۔ اور اس طرح مسلمانوں کے جان، مال، عزت، آبرو کو تباہ کرنے لگے۔ پہلے بمبئی میں فسادات کرائے۔ پھر یو۔ پی میں اور آخر میں بہار میں وہ قتل و غارت گری شروع کر دی جس کی مثال ہلاکو اور چنگیز خان کی بے محابا خونریزیوں اور آتش فشانیوں میں بھی نہیں ملتی۔ جن صوبوں میں مسلمان اکثریت میں تھے جب یہ خبریں وہاں پہنچیں تو لازمی تھا کہ اس سے ان کا خون کھول جاتا۔ وہ اس پوزیشن میں تھے کہ اپنے مظلوم بھائیوں کے خون کا بدلہ یہاں کے

ہندوؤں سے لے لیں۔ کہا جاتا ہے کہ "جنگ اور محبت میں ہر حربہ جائز ہوتا ہے۔" لیکن یہ کچھ ان کے ہاں جائز ہوتا ہے جن کے سامنے زندگی کی کوئی مستقل اقدار نہیں ہوتیں۔ قائداعظمؒ کی ساری جنگ اپنی مستقل اقدار کے تحفظ اور استحکام کے لئے تھی۔ ان کے مطالبۂ پاکستان کی بنیاد اس دعویٰ پر تھی کہ ہم ایک ایسا خطۂ زمین چاہتے ہیں جس میں ہم اپنی ان اقدار کو فروغ دے سکیں اور ان کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔ اس لئے وہ کب روا رکھ سکتے تھے کہ بہار کے مسلمانوں کے .... قتلِ عام کا انتقام پنجاب کے ہندوؤں سے لیا جائے۔ انہوں نے ۱۱ نومبر ۱۹۴۶ء کو اپنی قوم کے نام ایک ضبط انگیز اپیل شائع کی جس میں کہا کہ:

> میں خدائے عظیم سے دعا کرتا ہوں کہ مسلمان کے دامن پر وہ بدنما داغ نہ لگے جس کا مظاہرہ مظلوم مسلمانوں پر انسانیت سوز مظالم کر کے بہار میں کیا گیا ہے۔ ہمیں تہذیب و شرافت کو کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیئے۔ مسلمانوں پر جو ظلم ہو رہے ہیں۔ ان سے ہمارا کلیجہ چھلنی ہو رہا ہے لیکن ہم مسلم اکثریت والے صوبوں میں بے گناہوں کو مار کر اپنا دل ٹھنڈا نہیں کریں گے۔ میں مسلمانوں سے بزور اپیل کروں گا کہ وہ جہاں بھی اکثریت میں ہوں، غیر مسلموں کی حفاظتِ جان اور مال کے لئے جو کچھ بھی ممکن ہو کریں۔ اقلیت والے صوبوں میں مسلمانوں پر جو مظالم توڑے گئے ہیں جو بے گناہ مسلمان شہید کئے گئے ہیں۔ یا زخمی ہوئے ہیں یا مال اسباب لوٹا گیا ہے، ان کی قربانی رائیگاں نہیں جائے گی۔ وہ سمجھ لیں کہ انہوں نے جنگِ پاکستان اور آزادی کے لئے اپنا حق ادا کر دیا ہے۔

یہ تھی برادرانِ عزیز! قائداعظمؒ کی وہ عظمتِ کردار جس کی قوت سے انہوں نے اس عظیم جنگ کو جیتا تھا۔

(۰)

اس محاذ میں تیسرا فریق مخالف، خود مسلمانوں کے وہ گروہ تھے جو تحریکِ پاکستان کی مخالفت میں ہندوؤں سے بھی چار قدم آگے تھے۔ نیشنلسٹ مسلمان، جمعیت العلماء (مولانا آزاد، مولانا مدنی، مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید وغیرہم)، احرار، مسلم مجلس، انصار، سرخ پوش، جماعتِ اسلامی — انہوں نے اس مطالبہ کی مخالفت میں کیا کچھ کیا، اب اس کے تذکرہ سے کیا حاصل!

سفینہ جب کہ کنارے پر آ لگا غالبؔ
خدا سے کیا، ستم و جورِ ناخدا کہیئے!

ان سب کے علی الرغم، قائداعظمؒ نے یہ جنگ جیت لی اور ہندوستان تقسیم ہو گیا۔ لیکن ہم منزل پر پہنچ کر ایک ایسی سازش کا شکار ہو گئے جس کے لگائے ہوئے زخم ابھی تک مندمل نہیں ہو سکے — بلکہ یوں کہیئے کہ جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے وہ سرطان (کینسر) کی طرح پھیلتے چلے جا رہے ہیں۔

آخری سازش

تقسیمِ ہند کے سلسلہ میں اصول یہ طے پایا تھا کہ جن علاقوں میں مسلمان اکثریت میں ہیں وہ پاکستان کا حصہ قرار پائیں گے۔ یہ اصول انگریز اور ہندو دونوں نے تسلیم کیا تھا۔ لیکن اس کے بعد پہلے تو اس قسم کی سازشیں شروع ہوئیں کہ سرحد جیسے علاقہ میں جہاں مسلمانوں کی آبادی نوّے فیصد سے کم نہ تھی، استصوابِ رائے کرایا گیا (کہ وہ ہندوستان

سکے ساتھ رہنا چاہتے ہیں یا پاکستان کے ساتھ) خدا خدا کر کے یہ مرحلہ طے ہوا تو یہ چال چلی گئی کہ ملک اصولی طور پر تقسیم پہلے ہو جائے اور حدود بندی بعد میں ہو۔ اور اس حدود بندی کا فیصلہ (ARBITRATION) یعنی ثالثی کی زد سے ہو۔ آج اتنے عرصے کے بعد ہم نہیں کہہ سکتے کہ قائداعظمؒ کے پیشِ نظر وہ کونسی مصلحتیں تھیں یا وہ کن دشواریوں میں گھرے ہوئے تھے کہ انہوں نے ایسے بنیادی مسئلہ میں انگریز کی ثالثی قبول کر لی۔ لیکن اس کا نتیجہ بہرکیف یہ ہوا کہ ہم نے جیتی ہوئی بازی ہار دی۔ گورداسپور کا ضلع مسلم اکثریت کا علاقہ تھا اور کسی کو اس کا وہم و گمان بھی نہ تھا کہ یہ ضلع ہندوستان کے ساتھ ملا دیا جائے گا۔ اس ضلع کی اہمیت کا اس سے اندازہ لگایئے کہ اگر یہ پاکستان کے ساتھ ملا دیا جاتا تو کشمیر کا مسئلہ پیدا ہی نہ ہوتا۔ یہی وہ ضلع ہے جس سے ہندوستان کو کشمیر کی طرف جانے کا راستہ ملا۔ صاف نظر آتا ہے کہ ہندو اور انگریز دونوں کے پیشِ نظر اس وقت کشمیر کا الحاق تھا۔ اس کے لئے کیا یہ گیا کہ اس ضلع کو ہندوستان کے ساتھ ملا دیا گیا اور اسی سے یہ سارے مسائل پیدا ہو گئے جو مسلسل اٹھارہ سال سے ہمارے لئے وجہ سوہانِ روح بن رہے ہیں اور نہ معلوم کب تک بنتے چلے جائیں گے۔ یہ وہ آخری تحفہ ہے جو ہمیں انگریز جاتے جاتے دے گیا اس فریب کاری کا ذکر قائداعظمؒ نے اگست ۱۹۴۷ء میں لاہور کی ایک تقریر میں ان الفاظ میں کیا۔

> ہم جانتے ہیں کہ ہمارے ساتھ کیسی کیسی بے انصافیاں اور زیادتیاں روا رکھی گئی ہیں۔ تقسیم کا کام ختم ہو چکا ہے اور ہمارے علاقے کو جس قدر کم کیا جا سکتا تھا کر دیا گیا۔ باؤنڈری کمیشن کا فیصلہ نہ صرف غیر منصفانہ ہے بلکہ بدنیتی پر بھی مبنی ہے۔ اسے قانونی فیصلہ نہیں کہا جا سکتا۔ یہ سیاسی فیصلہ ہے۔ بہرحال اب فیصلہ ہو چکا ہے۔ ہم نے جو وعدے کئے ہیں انہیں ہم پورا کریں گے۔ ہم اپنے الفاظ پر قائم ہیں۔

یہ سب سازشیں کس مقصد کے لئے کی جا رہی تھیں، اس کی غمازی لارڈ اٹیلی (جو اس وقت میجر اٹیلی تھے اور برطانیہ کے وزیرِاعظم) کی وہ تقریر کرتی ہے جو انہوں نے پارلیمان میں (INDEPENDENT BILL) پیش کرتے وقت کی تھی۔ انہوں نے کہا تھا۔

> ہندوستان تقسیم ہو رہا ہے لیکن مجھے امید واثق ہے کہ یہ تقسیم زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکے گی اور یہ دونوں ملکتیں جنہیں ہم اس وقت الگ الگ کر رہے ہیں، ایک دن پھر آپس میں مل کر رہینگی۔
>
> (پاکستان ٹائمز $\frac{12}{45}$ ۱۵)

برطانیہ کا وزیرِاعظم یہ کہہ رہا تھا۔ ہندو پاکستان پر حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہا تھا — اور قائداعظمؒ لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے کہہ رہے تھے کہ۔

> ہم کوشش کریں گے کہ دولتِ مشترکہ برطانیہ، ہندوستان اور ہمسایہ حکومتوں سے ہمارے تعلقات خوشگوار رہیں۔

ضمناً یاد آ گیا — جب لارڈ ماؤنٹ بیٹن، ۱۳ اگست ۱۹۴۷ء کو انتقالِ اختیارات کے سلسلہ میں کراچی آیا ہے تو اس نے پاکستان کے گورنر جنرل (قائداعظمؒ) سے کہا تھا کہ پاکستان کو حکومت مل رہی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جہاں تک غیر مسلم اقلیتوں کا تعلق ہے، پاکستان شاہنشاہ اکبر کی (رواداری کی) پالیسی پر عمل کرے گا۔ اس پر قائداعظمؒ نے جھٹک کر جواب دیا کہ ہمیں اس تلقین کی ضرورت نہیں۔ ہم ان روایات کے حامل ہیں جن کی رو سے ہمیں غیر مسلموں کے ساتھ رواداری

ہی کا نہیں بلکہ فیاضانہ سلوک کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔

خراجِ تحسین

یہ تھا برادرانِ عزیز! ملتِ اسلامیہ کا وہ چراغ جس نے لاکھ اندھیروں کا مقابلہ کیا اور کامیاب و کامران دنیا سے رخصت ہوا۔ ان کی وفات پر دنیا کے عظیم سیاستدانوں اور مفکروں نے ان کی بارگاہ میں خراجِ تحسین پیش کیا۔ جیسے کہ لنڈن ٹائمز جیسے اخبار نے لکھا کہ

> انہوں نے اپنی ذات کو ایک بہترین نمونہ پیش کر کے اپنے اس دعویٰ کو ثابت کر دیا کہ مسلمان ایک علیحدہ قوم ہے۔ ان میں وہ ذہنی لچک نہیں تھی جو انگریز کے نزدیک ہندوستانیوں کا خاصا ہے ان کے خیالات ہیرے کی طرح قیمتی مگر سخت، واضح اور بیّن ہوتے تھے۔ ان کے دلائل میں ہندو لیڈروں جیسی حیلہ سازی نہ تھی۔ بلکہ وہ جس نقطۂ نظر کو ہدف بناتے تھے اس پر براہِ راست نشانہ باندھ کر وار کرتے تھے۔ وہ ایک ناقابلِ تسخیر قوت تھے۔

غیر تو یہ کہہ رہے تھے لیکن (کس قدر مقامِ تاسف ہے کہ) خود "اپنے" ۔ جو ہندوستان سے بھاگ کر پاکستان میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے تھے اور پاکستان نے انہیں ان کی مسلسل مخالفت کے باوجود، نہایت کشادہ ظرفی سے پناہ دی تھی ۔۔۔ اسی قائداعظمؒ کے متعلق یہ زہر فشانی کر رہے تھے کہ

> اس پورے گروہ میں ایک کوہ کن بھی نہ نکلا جو بازی کھو دینے کے بعد سر دے سکتا۔ ساری جماعت بازی گروں سے بچی پڑی تھی جنہوں نے عجیب عجیب گلابازیاں کھا کر دنیا کو اپنی بودی سیرت اور کھوکھلے اخلاق کا تماشا دکھایا اور اس قوم کی رہی سہی عزت خاک میں ملا دی جس کے وہ نمائندے تھے۔ (ترجمان القرآن۔ اگست ۱۹۴۸ء)

(۰)

بسترِ مرگ سے

ایسا نظر آتا ہے کہ قائداعظمؒ کو اپنی زندگی کے آخری ایام میں ہندوستان کے مذموم عزائم کا اندازہ ہو گیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے بسترِ مرگ سے کہا تھا۔

> خدائے عظیم و برتر کی قسم! جب تک ہمارے دشمن ہمیں اٹھا کر بحیرۂ عرب میں نہ پھینک دیں ہم ہار نہ مانیں گے۔ پاکستان کی حفاظت کے لئے میں تنہا لڑوں گا۔ اس وقت تک لڑوں گا جب تک میرے ہاتھوں میں سکت اور میرے جسم میں خون کا ایک قطرہ بھی موجود ہے۔ مجھے آپ سے کہنا ہے کہ اگر کوئی ایسا وقت آ جائے کہ پاکستان کی حفاظت کے لئے جنگ لڑنی پڑے تو کسی صورت میں ہتھیار نہ ڈالیں۔ پہاڑوں، جنگلوں اور دریاؤں میں جنگ جاری رکھیں۔
> (ڈاکٹر ریاض علیشاہ کی کتاب۔ قائداعظمؒ کے آخری ایام)

سترہ سال کے بعد ۔۔۔ بالآخر وہ وقت بھی آ گیا۔ اور للہ الحمد کہ ہماری فوجوں نے قائداعظمؒ کی توقعات کو پورا کر

ہمارے فوجیوں کے کردار

دکھایا۔ وہ اس وقت زندہ ہوتے تو اپنے ان شاہین بچوں پر بڑا فخر کرتے۔ نہ صرف اس لئے کہ انہوں نے میدانِ کارزار میں بے مثال جرأت اور بہادری کا ثبوت دیا ہے بلکہ اس لئے بھی کہ انہوں نے سخت آزمائش کے وقت اپنی ان اخلاقی روایات کو قائم رکھا ہے جس کی تلقین

قائداعظمؒ نے سانحۂ بہار کے سلسلہ میں مسلم اکثریت کے صوبوں سے کی تھی۔ آپ کو معلوم ہے کہ حالیہ جنگ میں جہاں ہندوؤں نے ہنستی شہری آبادیوں کو تباہ و برباد کیا، ہماری عصمت و عفت پر بھی ڈاکے ڈالے، وہ ہماری جوان بیٹیوں کو ٹرکوں میں بھر کے لے گئے۔ ہمارے جانباز، غیور، باہمت سپاہیوں نے ان مناظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اس کے بعد انہی سپاہیوں کا ہندوؤں کے علاقہ پر قبضہ ہوا۔ اب موقعہ تھا کہ یہ ہندوؤں کی اس کمینہ روش کا انتقام یہاں کی عورتوں کی بےحرمتی سے لیتے۔ لیکن انہوں نے کیا کیا، اس کے متعلق مجھ سے نہیں، خود ہندوؤں کے ذمہ دار لیڈروں کی زبان سے سنئیے۔

ہندوستان کی لوک سبھا (پارلیمان) میں وہاں کے ایک ممبر مسٹر کنور سنگھ نے کہا کہ فاضلکا سیکٹر میں مسلمان سپاہیوں نے ہندوستانی عورتوں کو اغوا کیا۔ اس پر وہاں کے وزیر دفاع مسٹر جگجیون رام نے کہا کہ میرے علم میں ابھی تک کوئی ایسا واقعہ نہیں آیا۔ تاہم میں اس کی تحقیق کرونگا اور اس تحقیق کے سلسلہ میں مشرقی پنجاب کے وزیر اعظم مسٹر رام کشن نے اعلان کیا کہ

پاکستانی سپاہیوں نے کسی ایک عورت کو بھی اغوا نہیں کیا۔

انتقام لینے کی قوت رکھتے ہوئے، ضابطۂ اخلاق کی اس طرح پابندی کرنا، بڑی ہمت کا کام ہے۔ اور اس بلندیٔ کردار اور ضبطِ نفس کا مظاہرہ، ان فوجی نوجوانوں کی طرف سے ہوا جنہیں ہمارا "مذہب پرست" طبقہ "ٹیڈی بائیز" "ٹیڈی بائیز" کہہ کہہ کر، بدنام کیا کرتا تھا۔

خطرہ کا مقام

بہرحال میں کہہ یہ رہا تھا کہ قائداعظمؒ نے اپنے بسترِ مرگ سے پاکستان کی مدافعت کے لئے جو تلقین کی تھی، ہماری افواج نے اسے میدانِ جنگ میں پورا کر کے دکھا دیا۔ لیکن اس کے بعد اب ہم پھر اسی مقام پر آگئے ہیں جس مقام پر اگست ۱۹۶۵ء میں تھے۔ یعنی جب ہماری جنگ میدانِ کارزار سے ہٹ کر بساطِ سیاست کی طرف منتقل ہو گئی تھی اور جہاں ہم تاشقند کو مان کر اتنا بڑا فریب کھا گئے تھے۔ ہمیں امید ہے کہ اب ہم اس تجربہ سے فائدہ اٹھائینگے اور دوبارہ اس قسم کا دھوکا نہیں کھائینگے کہ

مومن ایک سوراخ سے دو مرتبہ نہیں ڈسا جاتا۔

کامیابی کا راز

اس قسم کے مہیب خطرات میں، کامیابی کا راز کیا ہے؟ اس کے متعلق قائداعظمؒ کی ہی زبان سے سنئیے۔ انہوں نے پاکستان کی جنگ لڑتے ہوئے کہا تھا کہ

> اس وقت میدانِ سیاست میں ہندو مسلمانوں کی جنگ ہو رہی ہے۔ لوگ پوچھتے ہیں کہ کون فتحیاب ہوگا۔ علمِ غیب تو خدا کو ہے، لیکن میں ایک مسلمان کی حیثیت سے علی رؤس الاشہاد کہہ سکتا ہوں کہ اگر ہم قرآن مجید کو اپنا آخری اور قطعی رہبر بنا کر، ثبات و استقامت پر کاربند رہیں اور اس ارشادِ خداوندی کو کبھی فراموش نہ کریں کہ مسلمان سب بھائی بھائی ہیں تو ہمیں دنیا کی کوئی طاقت یا کئی طاقتوں کا مجموعہ بھی مغلوب نہیں کر سکتا۔

یعنی "قرآن مجید کو اپنا آخری اور قطعی رہبر بنا کر ثبات و استقامت پر کاربند رہنا اور اس ارشاد خداوندی کو سامنے رکھنا کہ مسلمان سب بھائی بھائی ہیں"۔۔۔ اس سے وہ قوت حاصل ہوتی ہے جس کا مقابلہ دنیا کی کوئی طاقت نہیں کر سکتی۔ خدا کرے کہ ہمیں یہ قوت حاصل ہو جائے۔! ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم۔

والسلام

(۲)